ندا فاضلی
حیات و جہات
محمد یوسف رضا

نام	:	محمد یوسف رضا
مقام پیدائش	:	قصبہ سانکھنی، ضلع بلند شہر، اُتر پردیش
والد	:	ڈاکٹر محمد افتخار
ابتدائی تعلیم	:	اسلامیہ پرائمری امدادی مکتب، سانکھنی، ضلع بلند شہر، اُتر پردیش
ثانوی تعلیم	:	حیدری انٹر کالج سانکھنی، ضلع بلند شہر، اُتر پردیش
اعلیٰ تعلیم	:	بی۔ اے اور ایم۔ اے چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی۔ میرٹھ ایم۔ فل — جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی پی ایچ۔ ڈی — جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی (جاری) (NET-JRF)

گرامی قدر پروفیسر صاد...

...سے

محمد یوسف رضا

۱۰، مئی ۲۰۱۹

9990778665

ندا فاضلی: حیات و جہات

محمد یوسف رضا

صادق

ندا فاضلی: حیات و جہات

مصنف

محمد یوسف رضا

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

NIDA FAZLI: HAYAAT-O-JEHAAT

by

Mohd. Yusuf Raza

E-mail: kaifisultan@gmail.com

Year of Edition 2019

ISBN 978-93-88736-80-0

₹ 350/-

نام کتاب : ندا فاضلی: حیات و جہات

مصنف و ناشر : محمد یوسف رضا

سنِ اشاعت : ۲۰۱۹ء

قیمت : ۳۵۰ روپے

تعداد : ۵۰۰

صفحات : ۳۰۴

کمپوزنگ : شاہ رخ عبیر

مطبع : روشان پرنٹرس، دہلی۔۶

رابطہ/پتہ : مکان نمبر B-276، گلی نمبر 6، سبھاش وہار نارتھ گھونڈا، دہلی۔110053

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3191, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)

Ph : 23216162, 23214465, 45678286, Fax : 0091-11-23211540

E-mail: info@ephbooks.com, ephindia@gmail.com

website: www.ephbooks.com

انتساب

دادا ڈاکٹر مولانا محمد کاظم حسین (مرحوم)

اور

مادرِ علمی اسلامیہ پرائمری امدادی مکتب، سانکھنی،
حیدری انٹر کالج سانکھنی کے نام

صادق

فہرست

مقدمہ

جس دور میں ہم سانس لے رہے ہیں اس میں محنت اور مشقت پر سہل پسندی نے سبقت لے لی ہے۔ کتب بینی سے دل اچاٹ ہو چلا ہے، انسان موبائل اور کمپیوٹر کے سحر میں گرفتار ہو کر رہ گیا ہے۔ موبائل اور کمپیوٹر نے جہاں محیر العقول افعال سے روشناس کرایا ہے وہیں بہت سے نقصانات سے بھی تعلق جوڑ دیا ہے۔ کتاب اور کتب بینی اس کی زد میں بری طرح آچکے ہیں۔ لوگ ہمہ وقت موبائل اور کمپیوٹر میں ہی مصروف رہنے لگے ہیں۔ ہمارے برعکس مغربی ممالک میں آج بھی کتب بینی عروج پر ہے۔ وہاں لاتعداد کتابیں اور رسائل شائع ہوتے ہیں اور لوگ ان سے استفادہ بھی کرتے ہیں۔ مغربی ممالک میں مصنفین کی مالی حالت ایسی نہیں ہے جیسی کہ ہمارے یہاں ہے۔ ہمارے یہاں مصنف اپنا پیٹ کاٹ کر کتاب کی اشاعت کراتا ہے اور اپنے دوستوں، عزیزوں میں اسے مفت تقسیم کر کے صاحبِ کتاب ہو جاتا ہے۔ اور مفت کتاب لینے والا اس کتاب کو اپنے گھر کی الماری میں سجا کر اپنے گھر آئے دوستوں اور مہمانوں کو یہ تاثر دیتا ہے کہ وہ ادبی ذوق و شوق کا مالک ہے اور اسی لیے بڑی تعداد میں کتابیں جمع کر رکھی ہیں۔ آج ہمارے یہاں جو مطالعہ گاہیں ہیں وہ مطالعہ کرنے والوں سے خالی ہیں۔ اگر یہی حال رہا تو آنے والی نسلیں ہمیں کتابوں میں بھی تلاش نہیں کر پائینگی۔

بیسویں صدی ایسی صدی ہے جس میں مختلف ادبی تحریکیں اور رجحانات سامنے

آئے جن سے متاثر ہو کر بہت سے ادیبوں اور شاعروں نے تخلیقات پیش کیں اور اس دور کے نمائند قلمکار کہلائے۔ ان میں ایک نام نؔدا فاضلی کا بھی ہے۔ ندا فاضلی ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اپنی نظموں، غزلوں، دوہوں اور گیتوں میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کو پیش کیا اور اپنی شاعری میں اس طرح کے الفاظ کو برتا ہے جو عام آدمی روزمرہ کے معاملات میں استعمال کرتا ہے۔ نؔدا فاضلی نے نظم، غزل، دوہے، گیت ماہیے کے علاوہ نثر میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن اردو شعر و ادب میں ان کی شناخت ان کی شاعری بالخصوص نظم سے ہے۔ دراصل نظم میں تخلیق کار اپنا مدعا پر اثر انداز میں بیان کرسکتا ہے۔ اپنی بات کو چاہے تو مختصر طور پیش کرے یا تفصیل کے ساتھ، دونوں ہی طریقے پر اثر ہوتے ہیں۔ لیکن یہ سب موقع و محل پر ہی منحصر ہوتا ہے کہ کس بات کو تفصیل سے بیان کرنا ہے اور کس بات کو مختصر طور پر۔ نظم میں بعض مواقع ایسے بھی آتے ہیں جہاں وضاحت بہت ضروری ہوتی ہے۔ اس سے نظم میں ایک طرح کا رچاؤ آجاتا ہے جس سے نظم کا حسن دوبالا ہوجاتا ہے۔ لیکن یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ یہی وضاحت اگر بے موقع و محل کردی جائے تو نظم نظم نہیں رہتی اور وہ حسن سے عاری ہوجاتی ہے۔ کیونکہ اس میں تسلسل، تشنگی اور تخلیقی حسن غائب ہوجاتا ہے اور نظم بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔

نؔدا فاضلی نظم اور غزل دونوں کے شاعر ہیں اور انہوں نے دونوں میں ہی متوازن انداز برتتے ہوئے طبع آزمائی کی ہے، ساتھ میں قارئین نے بھی ان کی غزلوں کے علاوہ نظموں کو بھی پسند کیا ہے۔ جہاں تک ان کی نظموں کا تعلق ہے تو یہ بات واضح ہے کہ ان کے کل شعری سرمائے میں کوئی طویل نظم نہیں ہے۔ نؔدا فاضلی نے نظموں اور غزلوں میں انفرادی موضوع، لب و لہجہ، آہنگ اور اسلوبِ بیان کے باعث مقبولیت حاصل کی۔ ندا فاضلی کی غزل گوئی سے متعلق میں یہ کہنا چاہونگا کہ ان کی غزلوں میں وہ خوبیاں موجود نہیں جو نظموں میں ہیں۔ الفاظ کا ارتباط ایک تشنگی ظاہر کرتا ہے۔ اشارے اور کنایے سے ان کی غزلیں عاری ہیں۔ کچھ غزلیں ضرور ایسی ہیں جن میں غزل کی وہ خوبیاں موجود ہیں جو غزل کو غزل بناتی ہیں۔ غزلوں اور نظموں کے علاوہ انہوں نے دوہے اور ماہیے بھی کہے ہیں۔ ماہیے میں انہوں نے کسی کی تقلید نہیں کی بلکہ ان

میں بھی اپنی روش کو برقرار رکھا ہے اور اپنے خاص اندازِ بیان سے اس میں بھی وہی موضوعات برتے ہیں جو نظموں، غزلوں اور دوہوں میں ہیں۔ بظاہر ماہیہ بہت مختصر نظم ہے لیکن ندا فاضلی نے اس میں جو وسیع مفہوم باندھا ہے وہ واقعی قابلِ داد و تحسین ہے۔ اس میں تسلسل اور الفاظ میں ارتباط ہے اور ساتھ ہی اس شگفتگی کا احساس بھی ملتا ہے جو شاعری کے لئے اشد ضروری ہے

ان کی کچھ نظمیں مزاحمتی شاعری کے زمرے میں آتی ہیں جن میں ''جنگ''، ''مردہ گھر میں بٹوارا'' اور ''ایک لٹی ہوئی بستی کی کہانی'' اہم ہیں۔ ان نظموں میں انہوں نے جس مزاحمت کو موضوع بنایا ہے وہ انفرادی نہیں ہے بلکہ اجتماعی ہے۔ ان کی مزاحمت برائی کے خلاف ہے، بدعنوانی کے خلاف ہے، ایسی طاقت کے خلاف ہے جو اپنے دم پر دوسروں کو کچل دینا چاہتی ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس مزاحمت میں شدت پسندی نہیں ہے بلکہ اسے ایسے شگفتہ مگر پر اثر انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ جب اس کا تیر دل میں اترتا ہے تو پتہ تک نہیں چلتا، لیکن تیر جیسے ہی دل میں پیوست ہو جاتا ہے تو اس کا درد ایک دم بے چین کر دیتا ہے اور قاری بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس درد کی کوئی پہچان نہیں ہوتی جیسے مسلکی، ملکی، مذہبی یا پھر ذاتی۔ بلکہ یہ درد انسانیت کا درد ہوتا ہے جو بلا تفریق مذہب و ملت ہر مظلوم کے لئے پیدا ہوتا ہے۔ اور ایک دردمند انسان کا دل مظلومیت، دکھ، درد، بے بسی اور ناانصافی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر وہ اس کے خلاف کھل کر احتجاج نہیں کر سکتا تو اپنے طور پر اس کا سدِ باب کرتا ہے۔ کیونکہ تخلیق کار ہر معاملے کو اپنے طور پر دیکھتا اور پرکھتا ہے۔ اور اسی کے اعتبار سے اپنا ردِ عمل ظاہر بھی کرتا ہے۔ ندا فاضلی کی شاعری میں ایسے عناصر موجود ہیں جو انسان کو حوصلہ مندی عطا کرتے ہیں اور کائنات کے مصائب و مسائل سے لڑنے کی ترغیب بھی دیتے ہیں۔ کیونکہ ندا فاضلی خود ان تمام مسائل سے دوچار ہوئے ہیں۔ انہوں نے حیات و کائنات کی قدر و قیمت اور اہمیت کو سمجھا ساتھ ہی اپنی تخلیقات سے دوسروں کو جینے کا سلیقہ سکھانے کی سعی کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں مایوس کن فضا موجود نہیں۔

یہ کتاب "ندا فاضلی: حیات و جہات" تین ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں ندا فاضلی کے سوانحی کوائف پیش کیے گئے ہیں اور ساتھ ہی ان کے عہد سے متعلق گفتگو بھی کی گئی ہے۔ ان کا عہد کن کن پریشانیوں کا شکار رہا، قومی سطح پر بھی اور بین الاقوامی سطح پر بھی اس کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس عہد کے سیاسی، سماجی و معاشی حالات کو پیش کیا گیا ہے اور ان تمام حالات کا اردو شعر وادب پر کس طرح اور کیسا اثر پڑا۔ ان کا عہد سیاسی تبدیلیوں کا شکار رہا، جس میں انگریزوں کی غلامی کی زنجیروں کو توڑتے ہوئے ہندوستان کا ہر آدمی ایک نئے ماحول میں داخل ہوتا ہے اور پھر سیاسی منظر نامہ بھی بدل جاتا ہے۔ لیکن یہ منظر ایسا تھا جس کے متعلق کسی نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ یہ کہ آزادی تو ملی لیکن انسان آزاد ہو کر بھی آزاد نہ ہو سکا اور اسے خون میں نہائی ہوئی آزادی پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔ پہلے ایک ملک یعنی ہندوستان (غیر منقسم) کے لیے آزادی کی جدوجہد، لیکن اچانک ۱۵ راگست ۱۹۴۷ کو آزادی کے ساتھ ملک کے دو حصوں میں تقسیم ہونے کا اعلان ہوا۔ اسی کے نتیجے میں دونوں ملکوں میں جو ابھی ایک روز پہلے ہی ایک ملک تھا، خونریزی وقتل وغارت گری کا ایسا بازار گرم ہوا کہ انسانیت تار تار ہو کے رہ گئی۔ لیکن ان تباہ کن حالات میں اردو شعر وادب نے اتنی وسعت حاصل کی کہ بیسویں صدی کو اردو شعر وادب کا عہد زریں کہا گیا۔ اس عہد میں افسانہ کو سب سے زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ اس کے علاوہ ناول، غزل، نظم نے بھی خاصا عروج پایا۔ پہلے باب میں ان تمام حالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

ندا فاضلی کب اور کہاں پیدا ہوئے ان کی ابتدائی تعلیم کس جگہ اور کن حالات میں ہوئی اور ساتھ ہی ان کی تاریخ پیدائش اور جائے پیدائش کو بھی تحقیق کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ میں نے ان کی تاریخ پیدائش سے متعلق بمبئی میں ان کی شریک حیات محترمہ مالتی جوشی سے گفتگو کی۔ انھوں نے اس سے متعلق مجھے کچھ ضروری معلومات دیں جن کا احاطہ میں نے اس باب میں کیا ہے۔ ان کی شادی سے متعلق یہ جانکاری کہ کب ہوئی، کہیں نہیں ملتی۔ لیکن مالتی جوشی

نے بتایا کہ انھوں نے مذہبی یا قانونی طور پر شادی نہیں کی تھی بلکہ یونہی ساتھ رہنے لگے تھے۔ اگر آج کے دور کے اعتبار سے کہا جائے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ندا فاضلی اور مالتی جوشی Live in relationship میں رہے۔ اسی دوران ان کے ایک بیٹی بھی ہوئی جس کا نام تحریر فاطمہ رکھا گیا لیکن ندا فاضلی کے انتقال کے بعد بیٹی کے نام سے فاطمہ الگ کر کے اس میں فاضلی جوڑ دیا گیا اور وہ تحریر فاطمہ سے تحریر فاضلی ہو گئیں۔

باب دوم میں ندؔا فاضلی کی نظموں کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے اور یہ دو ذیلی ابواب پر مشتمل ہے۔ (الف) موضوعاتی مطالعہ اور (ب) زبان اور اسلوب۔ (الف) میں موضوعات کے اعتبار سے ان کی نظموں کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مشترکہ تہذیب، فرقہ وارانہ فسادات، گاؤں شہر کی عکاسی، آفاقی موضوعات اور عشق و رومان۔ ندا فاضلی کی نظموں کے ساتھ ساتھ ان کے معاصرین کی نظموں کو بھی انہی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جیسے فسادات سے متعلق موضوع کو ان سبھی شعراء نے برتا ہے، سبھی کی اپنے اپنے اسلوب کے ساتھ کہی گئی نظموں کا مطالعہ اس طرح پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ شاعر کے شعری اسالیب سامنے آجاتے ہیں۔

میں نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ ان کی نظموں کا تجزیہ ان کے عہد کے اعتبار سے کیا جائے۔ ندا فاضلی وہ واحد شاعر ہیں جنھوں نے کبیؔر اور نظیؔر کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ان کے علاوہ اردو شاعری کے منظر نامے پر کوئی دوسرا شاعر نظر نہیں آتا۔ ان کی نظموں پر جدیدیت کا کیا اثر پڑا اور انھوں نے اسے کس طرح برتا، اس کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ندا فاضلی کے معاصرین کے یہاں جدیدیت میں ابہام بہت ہے جس سے ان کی نظموں کو سمجھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے اور نظم کے اصل معنی تک قاری کی رسائی نہیں ہو پاتی۔ لیکن ندا فاضلی نے جدیدیت کو اپناتے ہوئے ایسا اسلوب اختیار کیا ہے جس سے قاری کو نظم کی تفہیم میں دشواری نہیں ہوتی، اور ان کا یہی منفرد انداز انھیں ان کے معاصرین میں نمایاں بناتا ہے۔ دوسرے ذیلی باب (ب) میں ان کی زبان او

راسلوب سے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔انھوں نے اپنی شاعری بالخصوص نظموں میں آسان اور سادہ الفاظ سے اپنے خیال کو پیش کیا ہے۔ان کا اسلوب کچھ ایسا ہے کہ نظموں کی تفہیم میں کوئی رکاوٹ نہیں آتی۔عام آدمی کی زندگی میں استعمال ہونے والے الفاظ کے توسط سے اپنی نظموں کو ہر خاص و عام کے لیے دلچسپ بنادیا ہے، اور یہی ان کی انفرادیت ہے۔

باب سوم ندا فاضلی کی غزل، دوہے، گیت، ماہیے اور دیگر اصنافِ سخن کے ساتھ نثری تصانیف پر مشتمل ہے جسے ''ندا فاضلی کی دیگر نگارشارت'' کا عنوان دیا گیا ہے۔غزل، دوہے ماہیے اور گیتوں کا مختصر طور پر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ندا فاضلی جتنے مشہور اردو شعر وادب میں تھے اتنے ہی ہندی میں تھے۔اس کی وجہ ان کی مشترکہ زبان اور مشترکہ تہذیب والی شاعری ہے۔ان کے کچھ شعری مجموعے ہندی رسم الخط میں بھی شائع ہوئے۔وہ اکثر ہندی کوی سمیلن میں حصہ لیتے تھے۔ اردو میں وہ واحد شاعر تھے جنھیں ہندی میں بھی سراہا گیا۔ان کے نثری اثاثے میں بھی کئی تصانیف ہیں۔اسی باب سوم میں ندا فاضلی کے سہو کا بھی ذکر ہے جو غالبؔ او رمومنؔ سے متعلق ہے۔

ان کی غزلوں میں بھی مختلف قسم کے خیالات بیک وقت موجود ہیں، کہیں گنگا جمنی تہذیب ہے، کہیں والدین اور بچوں سے پیار ہے، کہیں ناسٹلجیا ہے، کہیں پامال ہوتی انسانی قدریں ہیں۔یہ بات قابل غور ہے کہ انھوں نے نظم اور غزل میں تقریباً یکساں موضوعات کا انتخاب کیا ہے۔استعاراتی اور علامتی اسلوب نظموں کے علاوہ غزلوں میں بھی ملتا ہے۔المختصر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ندا فاضلی ایک ہمہ جہت تخلیق کار ہیں اور اپنے معاصرین میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔لیکن بطور نظم نگار ان کی حیثیت زیادہ مستحکم نظر آتی ہے۔

ابواب کے بعد کتابوں اور رسائل کی فہرست درج کی گئی ہے جو کتابیات کے عنوان سے ہے۔اس میں ان کتابوں اور رسائل کے نام درج ہیں جن سے میں نے اس

کتاب کی تکمیل میں استفادہ کیا ہے۔

استاذ مکرم جناب پروفیسر کوثر مظہری صاحب کے مشفقانہ مشورے اور حوصلہ افزائی نے اس کتاب کی تکمیل میں بے حد مدد کی۔ میں ان کا شکریہ کسی بھی طرح ادا تو نہیں کر سکتا لیکن یہ دوہا ان کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

گرو گووند دوؤ کھڑے کاکے لاگوں پائے
بلیہاری گرو آپ نے گووند دیو بتائے

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو کے دیگر اساتذہ کرام کا بھی شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہے۔ جن سے میں نے وقتاً فوقتاً فیض حاصل کیا۔ تحقیق کے دوران جن کتب خانوں میں جانا ہوا ان میں ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ اور دارا شکوہ لائبریری اُردو اکادمی دہلی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ دارا شکوہ لائبریری کی چیف لائبریرین محترمہ نزہت مہدی صاحبہ کا بہت شکر گزار ہوں جنھوں نے اُمید سے زیادہ مواد کی فراہمی اور کتب و رسائل کے سلسلے میں میری مدد کی۔ فخر الدین علی احمد ریسرچ لائبریری غالب انسٹی ٹیوٹ ماتا سندری لین دہلی کے لائبریرین جناب عبدالواحد صاحب کا بھی شکریہ کہ جنھوں نے یہ کہہ کر مجھ سے پیچھا چھڑا لیا کہ اردو شعر و ادب میں ندا فاضلی کا Contribution بہت کم ہے اسی لیے میں کوئی مدد نہیں کر سکتا اور واقعی انہوں نے میرے دس بارہ مرتبہ وہاں جانے اور مدد مانگنے کے باوجود کوئی دلچسپی نہیں لی۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی کی سینٹرل لائبریری اور دہلی یونیورسٹی کی سینٹرل لائبریری کے اسٹاف کا بھی شکر گزار ہوں۔ اور پنڈت ہر دیال پبلک لائبریری دریا گنج کا بھی ذکر لازمی ہے کیونکہ یہاں سے ندا فاضلی کی ہندی کتابوں سے متعلق مواد حاصل ہوا۔ ساتھ ہی اپنے ان تمام ساتھیوں کا شکر گذار ہوں جنھوں نے مقالے سے متعلق مواد کی فراہمی میں ہر ممکن مدد کی۔ جناب جینت پرمار صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے ایسے مشکل وقت میں کہ جب مجھے محمد علوی سے متعلق معلومات کہیں سے دستیاب نہیں تھیں تو انھوں نے احمد آباد سے فون پر میری رہنمائی کی۔ بھوپال میں ندا فاضلی کے دوست جناب محمود ملک اور ڈاکٹر سیفی سرونجی کا بھی شکر گزار ہوں کہ جن سے میں ملا اور انھوں نے ندا فاضلی سے متعلق

اہم معلومات مجھ تک پہنچائیں۔ ندا فاضلی کی شریک حیات محترمہ مالتی جوشی نے بھی میری ہرممکن مدد کی، ان کا بھی شکریہ۔ اور سہ ماہی اردو رسالہ ''نیا ورق'' کے مدیر جناب شاداب رشید صاحب کا بھی شکریہ جنھوں نے مجھے اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔

اس کتاب کی تکمیل میں جن بزرگوں، کرم فرماؤں اور دوستوں نے اپنے بیش قیمتی مشوروں سے نوازا اور کتابوں کی فراہمی میں تعاون کیا ان میں سب سے پہلے جناب ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اس کتاب کے مسودے کا ایک ایک لفظ بغور پڑھا اور مجھے اپنے بے حد مفید مشوروں سے نوازا۔ اس کے بعد پروفیسر شہپر رسول، پروفیسر شہزاد انجم، پروفیسر ابنِ کنول، پروفیسر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر خالد علوی شامل ہیں۔ میں ان تمام حضرات کا فرداً فرداً شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اپنے شعبہ کے دیگر اساتذہ کرام کا بھی شکریہ جن سے میں نے وقتاً فوقتاً فیض حاصل کیا۔ خاص طور سے ڈاکٹر سرور الہدیٰ صاحب کا کہ جنھوں نے مجھے ایسے وقت میں ''اعتراف'' کا ندا فاضلی نمبر فراہم کیا کہ جب میں سبھی جگہ سے مایوس ہو چکا تھا۔ اپنے دوستوں میں عالیہ، محمد رضا (ریسرچ اسکالر دہلی یونیورسٹی)، شاہد اختر، تخمینہ حبیب (ریسرچ اسکالر جامعہ ملیہ اسلامیہ)، شاہ رخ عبیر، محمد جاوید (اردو اکادمی دہلی) اور محمد تسنیم شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی، ان تمام کی معاونت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے تمام افرادِ خاندان بالخصوص والدِ محترم ڈاکٹر محمد افتخار، والدہ محترمہ انوری بیگم، برادرِ اکبر مرزا قائم رضا اور برادرِ اصغر محمد ممتاز کا شکر گزار ہوں جن کی دعائیں اور نیک خواہشات ہمیشہ میرے شاملِ حال رہیں۔

مجھے اس امر پر خوشی ہے کہ تلاش و جستجو اور تحقیق و تنقید کے بعد ندا فاضلی کی زندگی اور ادبی خدمات سے متعلق بیشتر مواد پہلی مرتبہ یکجا ہو کر ادبی دنیا کے سامنے آ رہا ہے۔ میں اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں یہ تو مجھے علم نہیں۔ لیکن ہاں! آپ سبھی سے توقع رکھتا ہوں کہ آپ اپنے مشوروں، تجاویز اور تنقید سے میری اصلاح اور حوصلہ افضائی کریں گے۔

محمد یوسف رضا

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ ۲۵

ندا کی شاعری کا متوازن جائزہ

''ندا فاضلی: حیات و جہات'' محمد یوسف رضا کی تحقیقی و تنقیدی کتاب ہے۔ محمد یوسف رضا نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے اپنے موضوع پر کام کیا ہے اور تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔

ندا فاضلی ہماری اردو شاعری خصوصاً جدید اردو شاعری کا ایک معتبر حوالہ ہے۔ آزادی کے بعد غزل کا منظر نامہ ہو یا نظم کی روایت، ندا فاضلی نے خود کو نہ صرف منفرد ثابت کیا ہے بلکہ نظم و غزل کو اعتبار بھی عطا کیا ہے۔ ندا کے یہاں موضوعات کی بوقلمونی، اجتماعی احساس، فن کی پختگی، عام فہم الفاظ خصوصاً مقامی الفاظ کا ہنر مندانہ استعمال اور قومی یکجہتی کا فروغ، انہیں اپنے معاصرین میں ممیز و ممتاز کرتا ہے۔

محمد یوسف رضا نے تحقیقی و تنقیدی پیرائے میں ایماندارانہ کوشش کی ہے۔ پہلے باب میں محمد یوسف رضا نے ندا فاضلی کی حیات سے متعلق تمام ضروری معلومات کو لفظوں کا پیرہن عطا کیا ہے۔ دوسرے باب میں ندا کی نظمیہ شاعری کا خاصا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ اس باب کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلے حصے میں موضوعاتی مطالعہ کے تحت محمد یوسف رضا نے اپنے مطالعے کو مختلف موضوعات فرقہ وارانہ فسادات، قومی یکجہتی، سماجی اور آفاقی موضوعات، گاؤں، شہر، ندا کی نظموں کو عشق و رومان میں سمیٹنے کی حتی الامکان کوشش

کی ہے۔ ہر موضوع کے تحت ندا کی معروف نظموں کا ان کے معاصرین شعرا زبیر رضوی، مخمور سعیدی، محمد علوی، مظہر امام سے تقابل کیا ہے اور غیر جانب دار رہتے ہوئے ندا کی نظموں کا جائزہ پیش کیا ہے۔

محمد یوسف رضا نے ندا فاضلی کی دیگر اصناف کی تخلیق کا بھی ایک اجمالی جائزہ پیش کیا ہے۔ غزل، دوہے، نغمے، ماہیے اور نثری تحاریر کو محمد یوسف رضا نے عمدگی سے پیش کیا ہے۔ ندا کی نظموں کا صحیح تجزیہ پیش کرتے ہوئے محمد یوسف رضا نے اپنی رائے کا بے باکانہ استعمال متعدد جگہ کیا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ کریں۔ نظم 'قومی یکجہتی' میں ندا نے طوائف خانے کو مندر و مسجد سے بہتر بتایا ہے۔ محمد یوسف رضا لکھتے ہیں:

> ''افسوس اس بات کا ہے کہ ندا کو مندر اور مسجد کا یہی پہلو کیوں نظر آیا اور انہوں نے ایک طوائف کے کوٹھے کو مندر و مسجد سے بہتر بھی بتایا۔ ہوسکتا ہے انہیں مذہب کا پاس بھی نہ ہو کیوں کہ کسی بھی مذہب کا ماننے والا کوٹھے کو مندر و مسجد سے بہتر بتانا تو دور کی بات ہے، موازنہ کرنا بھی پسند نہیں کرے گا۔'' (ص ۸۸)

محمد یوسف رضا نے ندا کی شاعری میں زبان کا بھی اچھا جائزہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے ندا فاضلی کی نظموں میں مقامی الفاظ، محاوروں اور ہندی الفاظ کے استعمال کو باریک بینی سے دیکھا ہے۔ زبان کے معاملے میں ندا اپنے معاصرین میں کس مقام پر ہیں، یہ ذرا مشکل سوال ہے۔ لیکن محمد یوسف رضا نے اپنی بساط بھر، اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔

> ''ندا فاضلی کو اردو ہندی دونوں میں اہم مقام حاصل ہے۔ ان کی شاعری جدت طرازی لیے ہوئے ہے۔ انہوں نے اردو ہندی کے سادہ الفاظ کو ایک ہی مالا میں پرو کر نظم میں دلکشی اور جاذبیت پیدا کر دی ہے۔ ان کی نظم نگاری میں پیچیدہ

الفاظ کم کم ہیں۔انہوں نے سادہ اور سلیس الفاظ کو ہی اپنی
شاعری کا ذریعہ بنا کر پیش کیا ہے۔'' (ص ۱۷۵)

محمد یوسف رضا نے ندا فاضلی کی شاعری خصوصاً نظموں کا سیر حاصل جائزہ پیش کیا ہے۔متعدد نظموں مثلاً پہچان، ایک قومی رہنما کے نام، ایک لٹی ہوئی بستی کی کہانی، انسان (فرقہ وارانہ فسادات) مردہ گھر میں بٹوارہ، کھیل، ایک منظر، اتفاق، قومی یکجہتی، سچائی (قومی یکجہتی) گلاب کا پھول، کامیاب آدمی، سماجی شعور (سماجی شعور) لاپتہ، پاسپورٹ آفیسر کے نام، کراچی ایک ماں ہے (سماجی رشتے) ایک دن کی سیر، بھور، سردی، سحر (گاؤں دیہات) چھوٹے شہر کی رات، پگھلتا دھواں، گھٹن، جیب کٹنے کے بعد، بمبئی (شہر) ایک مسکراہٹ، فاصلہ، بے خبری، انتظار، سمجھوتا، چھوٹی سی ہنسی، دیوانگی باقی رہے، مشورہ، وہ لڑکی (عشق و رومان) وغیرہ کا تجزیاتی مطالعہ درج موضوعات کے تحت کیا ہے۔

محمد یوسف رضا کی ناقدانہ نظر کا وصف خاص یہ ہے کہ وہ سچ کو سچ کہنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔انہیں ندا کی شاعری میں جہاں محاسن نظر آئے، ان کا ذکر بخوبی کیا ہے لیکن بعض مقامات پر وہ ندا کی خامیوں پر بھی خامہ فرسائی سے باز نہیں رہے ہیں۔امید ہے کہ محمد یوسف رضا کا یہ طریقہ کار انہیں آگے لے جائے گا اور وہ بہت جلد ایوان نقد میں اپنا مقام بنالیں گے۔

پروفیسر اسلم جمشید پوری
صدر شعبۂ اردو
چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ

دو دروازے ایک حویلی آمد رخصت ایک پہیلی
کوئی جا کر آنے کو ہے کوئی آ کر جانے کو ہے
(ندؔا فاضلی)

باب اوّل

ندا فاضلی: سوانحی کوائف

فنکار حقیقت میں سماج اور معاشرے کا پروردہ ہوتا ہے۔ وہ معاشرے سے بہت کچھ سیکھتا ہے۔ اس کی ذہنی نشوونما معاشرے میں رہ کر ہی ہوتی ہے سماج سے وہ جو بھی تجربات حاصل کرتا ہے انھیں وہ اپنی ذہنی ترنگوں میں ناپ تول کے بعد اس میں اضافہ کر کے سماج کو ہی لوٹا دیتا ہے۔ یہ کہنا درست ہے کہ فنکار کا سماج مقروض ہوتا ہے اور اس قرض کو سماج کبھی بھی فنکار کو نہیں لوٹا سکتا۔ کسی بھی فنکار کی شخصیت، زندگی، اس کے فکر وفن اور خدمات کا جائزہ لینے اور اس کی قدر و منزلت متعین کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے عہد، ماحول، تاریخی، معاشرتی اور ادبی حالات کا جائزہ لیا جائے۔

بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں پیدا ہونے والے ندؔا فاضلی کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں اختلاف ہے۔ ''امراوتی''، مہاراشٹر سے شائع ہونے والے سہ ماہی ''اردو'' ندا فاضلی نمبر 2014 جلد نمبر 4 شمارہ نمبر 1 اکتوبر تا مارچ 15-2014 مدیر وسیم فرحت کارنجوی نے ندؔا فاضلی کی تاریخ ولادت 1940 درج کی ہے۔ جب کہ دہلی بلدیہ کے اندراج میں ان کی تاریخ ولادت 12 اکتوبر 1938 درج ہے اور یہی تاریخ ولادت درست معلوم ہوتی ہے۔ میں نے اس سلسلے میں ندؔا فاضلی کی شریک حیات محترمہ مالتی جوشی سے فون پر گفتگو کی جو بمبئی میں مقیم ہیں تو انھوں نے بھی یہی بتایا کہ ندؔا فاضلی کی پیدائش کی تاریخ 12/ اکتوبر 1938 ہی درست ہے۔

غلام ابن سلطان مصطفیٰ آباد، جھنگ سٹی، پنجاب پاکستان اپنے ایک مضمون ''ندا فاضلی : جانے والوں سے دلوں کا سلسلہ جاتا نہیں'' میں ندا فاضلی کی جائے پیدائش سے متعلق لکھتے ہیں:

''ندا فاضلی (مقتدا حسن) (پیدائش: گوالیار، 12 اکتوبر 1938،
وفات: 8 فروری 2016) دہلی میں دل کا دورہ پڑنے سے چل بسے۔
اس یگانۂ روزگار ادیب کی رحلت پر دنیا بھر میں ان کے مداح شدتِ غم
سے سکتے کے عالم میں ہیں''۔

اس اقتباس میں انھوں نے ندا فاضلی کی جائے پیدائش گوالیار اور جائے وفات دہلی کو بتایا ہے جبکہ یہ کسی بھی زاویے سے درست نہیں ہے کیونکہ ندا فاضلی نے اپنے خودنوشت سوانحی ناول ''دیواروں کے بیچ'' میں اپنی جائے پیدائش دہلی کو بتایا ہے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ہر بچے کی پیدائش دہلی میں ہوتی ہے وہ اب تیسرے بچے کی
ماں بننے والی ہیں۔ دو کے بعد تیسرا بچہ ایسی حالت میں
مناسب نہیں ہے لیکن کیا کیا جائے تین مہینے پورے ہو چکے
ہیں............فوراً ہاسپٹل لے جایا جاتا ہے جہاں وقت سے
پہلے جمیل فاطمہ اپنی مرضی کے خلاف تیسرے بچے کو جنم دیتی
ہیں۔اس کا نام بڑے لڑکے مصطفیٰ حسن کے قافیے کی رعایت
سے مقتدیٰ تجویز ہوتا ہے یہی مقتدا حسن آگے چل کر قافیے کی
پابندی سے خود کو آزاد کر کے ندا فاضلی بن جاتے ہیں۔اس
ولادت کی تاریخ دہلی کارپوریشن کے رجسٹر میں
12 اکتوبر 1938 درج کی جاتی ہے''۔[۲]

اس اقتباس سے بات واضح ہو جاتی ہے کہ ندا فاضلی کی جائے پیدائش دہلی ہی ہے۔ان کی زندگی، فکر و فن، ادبی خدمات اور اہمیت وغیرہ کا جائزہ لینے کے لیے بیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے اکیسویں صدی کی ابتداء کے تاریخی، سیاسی و معاشرتی اور ادبی

حالات اور تحریکات کا مختصر جائزہ لینا ضروری ہے۔ جس دور میں ندا فاضلی نے ہوش سنبھالا وہ دور ترقی پسند تحریک کا دور تھا۔ تقسیم ہند کو ہماری قومی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ علمی، ادبی اور تہذیبی شعبوں کے ساتھ ساتھ زندگی کے تمام تر شعبوں پر اس کے اثرات مرتب ہوئے۔ تقسیم ہند نے باشندگان ہند و پاک کو متاثر کیا۔ آزادی تو ملی لیکن خون میں نہائی ہوئی۔ فیض نے اسی پس منظر میں یہ شعر کہا:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

اس تقسیم ہند کے نتیجے میں تمام انسانی رشتے پامال ہو گیے۔ ہر طرف قتل و غارت گری ،لوٹ مار اور ظلم و استبداد کا بازار گرم تھا۔ کل تک جو پڑوسی بھائی بیٹے باپ کی طرح ایک ساتھ مل کر رہتے تھے آج وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے اور بلا خوف ایک دوسرے کو قتل کر رہے تھے اور قتل کرنے کا طریقہ بھی ایسا کہ جس سے شیطان بھی شرما جائے۔ انسانی زندگی کو زندگی ہی نہ سمجھا گیا۔ ماں باپ کے سامنے ان کی اولاد کو قتل کیا گیا۔ انھیں جلایا گیا۔ ماؤں بہنوں، بیٹیوں کی عصمتیں لوٹی گئیں۔ یہ سارے مناظر انسانوں کے سامنے کچھ یوں تھے کہ ان میں احساس نام کی کوئی شے باقی نہ رہ گئی تھی، ہاں البتہ ایک چیز باقی تھی وہ تھی ان کی حیوانیت، جو انسانیت کا احساس ختم ہونے کے بعد ابھری تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ انسان نہ تو ہندوستان میں محفوظ تھا اور نہ پاکستان میں۔ جو لوگ پاکستان سے ہجرت کر کے ہندوستان آرہے تھے ان پر راستے میں مظالم ڈھائے جا رہے تھے اور جو لوگ ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان جا رہے تھے ان کو بھی راستے میں ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ گھر کے گھر جلا دیئے گئے اور ان کی راکھ کے ساتھ ساتھ انسان بھی راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔ شاید اسی سانحہ سے متاثر ہو کر ندا کو کہنا پڑا۔

"انسان میں حیوان یہاں بھی ہے وہاں بھی"

اس سارے سانحے سے اہل قلم دم بخود رہ گئے۔ کچھ صاحب قلم تو اس قدر ذہنی انتشار کے شکار ہوئے کہ انھوں نے ادب سے ہی ناتا توڑ لیا اور کچھ ایسے بھی تھے کہ جنھوں

نے اس حادثے کو ہی اپنی تخلیقی حسیت سے ہم آہنگ کرلیا۔ انھیں میں سے کچھ ان حالات سے ذرہ برابر بھی متاثر نہ ہوئے۔ جیسا وہ پہلے لکھ رہے تھے ویسا ہی لکھتے رہے۔

بڑے بڑے دماغ ہندوستان سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ مگر انھوں نے اپنی ہجرت کے اس درد کو اپنی تخلیقات میں پیش کر کے اردو شعر و ادب کو مالا مال کردیا۔ اس تقسیم کے درد کو نہ صرف ہندوپاک ہی میں محسوس کیا گیا بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوئے۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ انگریزی افسانہ نگار ولیم سی۔ ڈگلس william c.Douglas نے اپنے افسانے (A Girl with a basket) میں تقسیم کے اس درد کو بڑی ہنرمندی کے ساتھ منفرد انداز میں بیان کیا ہے۔

17 اگست 1947 کو ہندوستان کو دو حصوں (ہندوپاک) میں تقسیم کرتی ہوئی ریڈکلف لائن Redcliffe line نے صرف ہندوستان کی زمین ہی کو نہیں بانٹا بلکہ اس لائن نے انسانوں اور ان کے بیچ کے رشتوں کو بھی بانٹ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے بھرے پرے گھر کو جس میں ان کا بچپن بیتا تھا اور جن گلیوں میں وہ بڑے ہوئے تھے، چھوڑ دیا۔ اور اجنبی جگہ پر اجنبی لوگوں کے درمیان رہنے کو مجبور ہوئے۔

مقتدیٰ حسن ندا فاضلی کے خاندان کو بھی اسی حادثے سے دوچار ہونا پڑا۔ ان کا خاندان گوالیار کو چھوڑنے پر مجبور ہوا، اور آخر میں پاکستان کو اپنا وطن بنایا مگر اس میں بھی ندا فاضلی کو اپنے وطن کی مٹی نے باندھ کر رکھا اور وہ اکیلے ہندوستان میں رہ گئے۔ انھوں نے اپنے سوانحی ناول ''دیواروں کے بیچ'' میں ایک جگہ لکھا ہے:

> ''سب کے ٹکٹ اور پاسپورٹ آجاتے ہیں لیکن روانگی کے وقت ندا کے نہ ہونے سے جمیل فاطمہ کو اختلاج کا دورہ پڑ جاتا ہے، شہر میں چاروں طرف اس کی تلاش کی جاتی ہے اس کا کہیں پتہ نہیں لگتا۔ جمیل فاطمہ ہوش میں لائی جاتی ہیں وہ ندا کے بغیر جانے کے لیے راضی نہیں ہیں۔ مرتضیٰ حسن انھیں سمجھا بجھا کر کسی طرح رخصت کرتے ہیں

اور خود ندا کے انتظار میں رک جاتے ہیں۔ ان کا ٹکٹ
واپس ہوتا ہے۔ ویزا کی معیاد بڑھوائی جاتی ہے۔ مگر یہ
سب بے سود ہوتا ہے۔ اور آخر وہ بھی ندا کا پاسپورٹ
محلے میں کسی کو دے کر مجبوراً روانہ ہو جاتے ہیں۔ ان کے
جانے کے بعد ندا راجستھان کے مختلف علاقوں میں وقت
گنوا کر واپس آتا ہے۔ گھر والے جا چکے ہیں، گھر بک چکا
ہے، نہ رہنے کا انتظام ہے نہ کھانے پینے کا بندوبست''[3]

ندا فاضلی کے اپنے ہی وطن گوالیار میں بے گھر ہونے کے بعد موتی لال اور دوسرے لوگوں نے انھیں کمرہ دلانے میں مدد کی۔ اس وقت ندا فاضلی کے پاس نہ تو کوئی بستر، نہ کوئی برتن اور نہ ضروریات زندگی کے دیگر ساز وسامان موجود تھے، یہ ساز وسامان دوسرے لوگوں نے ہی ازراہ ہمدردی لاکر دیے۔ ندا فاضلی نے جس جگہ کو اپنی جائے اقامت کے لئے منتخب کیا تھا وہ جگہ کمیونسٹ پارٹی کے دفتر کے نزدیک ہی واقع تھی، اسی کے پاس ''ساہتیہ سنگم'' نام کی کتابوں کی ایک دوکان تھی جس میں دن بھر لوگوں کا ہجوم رہتا تھا۔ ندا فاضلی بھی اپنا دن کا وقت اسی کتاب کی دوکان میں مطالعے میں صرف کرتے تھے۔

ندا فاضلی کا اصل نام مقتدیٰ حسن ہے جس کے معنی پیشوا، یا رہنما کے ہیں۔ ندا ان کا تخلص ہے اور فاضلی کی نسبت اس بنا پر ہے کہ فاضلہ کشمیر میں ایک جگہ کا نام ہے جہاں ان کے آباء واجداد اقامت پذیر تھے۔

ندا فاضلی کے والد کا نام مرتضیٰ حسن ہے اور والدہ کا نام جمیل فاطمہ۔ مرتضیٰ حسن اپنے زمانے کے مشہور شاعر تھے اور دعا تخلص رکھتے تھے۔ مرتضیٰ حسن یوپی کے چھوٹے سے قصبے ڈبائی میں رہتے تھے اسی کی رعایت کرتے ہوئے اپنے تخلص دعا کے ساتھ ڈبائیوی لگاتے تھے۔ یہ ڈبائی تخلیقی اعتبار سے وسیع اور ذرخیز ہے۔ ڈبائی سے ہی اردو فکشن کے مشہور ومعروف نام جڑے ہوئے ہیں۔ جن میں

انتظار حسین اور پروفیسر ناصر محمود کمال ابن کنول قابل ذکر ہیں۔

مرتضیٰ حسن دعاؔ ڈبائیوی اردو کے مشہور شاعر نواب مرزا خاں داغؔ دہلوی کے جانشین نوحؔ ناروی کے ممتاز شاگرد تھے۔ مرتضیٰ حسن 13 جون 1900ء کو ڈبائی میں پیدا ہوئے اور تعلیم و تربیت بھی وہیں ہوئی۔ 1917ء میں دعاؔ کا تقرر ریلوے گوالیار میں بحیثیت کلرک ہوا اور 1954ء میں آفس سپرنٹینڈینٹ کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ان کے تین شعری مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں ''تصویر دعاؔ''، ''تاثیر دعا'' اور ''تنویرِ دُعا''۔ ''دوسرا شعری مجموعہ ''تاثیر دعا'' ندؔا فاضلی کے سال ولادت یعنی 1938 میں شائع ہوا۔ انہوں نے قطعات، غزلیں اور نظموں کے علاوہ رباعی، گیت اور واسوخت لکھے ہیں، ان کی شاعری سے چند اشعار پیش ہیں:

مری جان مانگی تو کیا تم نے مانگی
مری جان کا کیا مری جان ہوگا

یہ خود بھی پریشان ہے زندگی سے
اسے جو بھی لے گا پریشان ہوگا

خاموش زباں ہو جاتی ہے ہر ظلم روا ہو جاتا ہے
جب سامنے وہ آجاتے ہیں کیا جانئے کیا ہو جاتا ہے

اللہ نہ ڈالے وقت برا عالم ہی جدا ہو جاتا ہے
احباب بھی بچنے لگتے ہیں اچھا بھی برا ہو جاتا ہے

اور یہ شعر ملاحظہ کیجیے،

تکلیف کا رفتہ رفتہ سب احساب فنا ہو جاتا ہے
خود درد دوا بن جاتا ہے جب حد سے سوا ہو جاتا ہے

جو غالب کے مندرجہ ذیل شعر کی یاد دلاتا ہے۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

کچھ اور اشعار ملاحظہ کیجیے:

چار دن کا لطف دم بھر کی خوشی کچھ بھی نہیں
زندگی سب کچھ ہے لیکن زندگی کچھ بھی نہیں

ایک مجبورِ سراپا کی خوشی کیا؟ رنج کیا
آدمی کی کیا حقیقت آدمی کچھ بھی نہیں

ان اشعار میں لطفِ زبان اور حسنِ بیان کی خوبیوں کو صاف طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ دعا ڈبائیوی نے طویل بحروں میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ وہ اس طرح کی غزلوں میں احتیاط سے کام لیتے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

حسیناؤں کی سب ادائیں نرالی حسیں حسن و سیرت میں خود بھی نرالے
مگر سب کو اللہ محفوظ رکھے کسی کا کبھی ان سے پالا نہ ڈالے

کہاں تک حفاظت، حفاظت کی زحمت مجھے بھی ہوئی رنج و غم سے فراغت
یہ اچھا ہوا آج دل لے چلے تم تمہاری امانت تمہارے حوالے

وہ کہتے ہیں ہم کب ہیں وعدے کے سچے مگر تم کو بھی ہم نے جھوٹا ہی پایا
تمہیں جان پیاری تھی اب تک ہو زندہ نہ تم بات والے نہ ہم بات والے

نظم مفلسی ملاحظہ ہو:

مفلسی سے بڑھ کے دنیا میں کوئی لعنت نہیں
مفلسوں کی اس زمانے میں کہیں عزت نہیں

اہلِ زر جس حال میں ہوں لائقِ توصیف ہیں
کارہائے بد بھی ان کے قابلِ تعریف ہیں

دوسرے لوگوں کی طرح دعاؔ ڈبائیوی بھی اس تقسیم سے خوش نہیں تھے۔ وہ بھی اپنی جڑ سے اکھڑ کر اس پر ماتم کرنا نہیں چاہتے تھے۔ مگر حالات نے انھیں مجبور کر دیا اور وہ ترک وطن پر مجبور ہوئے۔ پاکستان جا کر بھی ان کے دل سے ہندوستان کی محبت ختم نہیں ہوئی اور اس درد کا اظہار انھوں نے اپنی شاعری میں کیا۔

سکونت پاکستان کے بعد وہ اپنے ہندوستانی لگاؤ کو اپنی شاعری میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

بھلا بلبل کے دل سے بھی چمن کی یاد جاتی ہے
جو کانٹا چبھ چکا ہے اس چبھن کی یاد جاتی ہے

دعاؔ اب تک میرے دل میں وہی عظمت ہے لشکر کی
کہیں نقل سکونت سے وطن کی یاد جاتی ہے

مرتضٰی حسن دعاؔ ڈبائیوی رنگین مزاج اور مجرے کے شوقین تھے۔ کئی طوائفوں سے ان کی شناسائیاں رہیں۔ یہ بھی مشہور ہے کہ ایک طوائف سے ان کے دو لڑکے بھی تھے۔ لیکن یہ بات کہیں سے صحیح ثابت نہ ہو سکی۔ اور نہ ہی ان دونوں لڑکوں اور ان کی ماں کی طرف سے اپنے حق کے لئے کسی قانونی کارروائی کی بات سامنے آئی۔ اس لئے اسے صرف قیاس ہی تصور کیا جانا چاہیے۔

مرتضٰی حسن کی شادی 35 سال کی عمر میں امت الحبیب کی چھوٹی صاحبزادی جو مرتضٰی حسن سے 10 سال چھوٹی تھیں، جمیل فاطمہ سے ہوئی تھی جو دہلی کے ایک باعزت سادات گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان میں بھی شعر و شاعری کا ذوق تھا اور خواتین کی نشستوں میں شرکت کرتی تھیں۔ فکر سخن میں اتنی محو ہو جاتی تھیں کہ اپنے سارے کام بھول جاتی تھیں۔ ان کے اشعار ماہنامہ ''عصمت'' یا ''رہنمائے تعلیم'' میں مخفی کے تخلص سے شائع بھی ہوئے۔

جمیل فاطمہ نے اس رشتے کو بخوبی نبھایا۔ ان کے بطن سے 8 اولاد ہوئیں۔ مقتدا حسن ندا فاضلی ان میں تیسرے نمبر کی اولاد تھے۔ ندا کی پیدائش کے بعد مجتبیٰ حسن، مبتدیٰ حسن، تسلیم، جاوید اور شاہینہ پیدا ہوئی۔ قمر طلعت سب سے بڑی تھیں۔ ان کے بعد مصطفیٰ حسن تھے جو ندا کے بڑے بھائی تھے۔ ان آٹھ بچوں کے علاوہ جمیل فاطمہ کے بطن سے اور بھی بچے پیدا ہوئے مگر وہ زندہ نہ رہ سکے۔

ندا فاضلی بچپن کے دنوں میں اکثر بیمار رہا کرتے تھے جس کی وجہ سے وہ جسمانی طور پر کمزور ہو گئے اور یہی وجہ ان کے چڑچڑے پن کی بھی رہی۔ ندا فاضلی گھر میں اکثر الگ تھلگ رہا کرتے تھے۔ کبھی کوئی ضرورت محسوس ہوتی تو وہ کسی سے نہیں کہتے تھے اور خاموش ہی رہتے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ بہت سی غلط فہمیوں کا شکار ہو گئے تھے۔ ندا فاضلی بچپن میں اس کشمکش میں مبتلا رہے کہ ان کے والدین دوسرے بھائی بہنوں کے مقابلے میں انھیں (ندا فاضلی) کم چاہتے ہیں اور یہ کشمکش انھیں آخری وقت تک رہی۔

ندا فاضلی کی ابتدائی تعلیم (پانچویں تک) حضورات اسکول میں ہوئی جو گوالیار کے مادھو گنج میں واقع ہے۔ میٹرک بھی ندا فاضلی نے گوالیار کے وی سی ہائی اسکول سے تھرڈ ڈویژن سے پاس کیا۔ ندا فاضلی کا رجحان پڑھائی کی طرف کم مائل تھا مگر والدہ کی سختی اور اصرار کی وجہ سے انھیں پڑھنا پڑا۔ والدہ ندا کو ڈاکٹر بنانا چاہتی تھیں۔ اسی مقصد سے انھوں نے ندا فاضلی کو وکٹوریہ کالج میں سائنس کے شعبہ میں داخل کرا دیا۔ لیکن دو سال تک ناکام ہونے کے بعد ندا کا شعبہ بدلنا پڑا اور سائنس کی جگہ آرٹس کے شعبہ میں پھر سے سال اول میں داخلہ لے کر تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ اسی دوران کچھ وجوہات کی بنا پر اس کالج کا نام وکٹوریہ کالج سے بدل کر رانی لکشمی بائی کر دیا گیا۔ اس میں اردو بطور ایک مضمون پڑھائی جاتی تھی۔ مگر طلبہ کی ناکافی تعداد کے سبب اس کالج سے اردو ختم ہو گئی اور ندا فاضلی بی اے میں ہندی لینے پر مجبور ہوئے۔ بی۔ اے مکمل کرنے کے بعد اسی کالج سے انھوں نے ایم۔ اے، بھی کیا۔ ایم۔ اے۔ مکمل کرنے کے بعد ہی انھوں نے اپنا تخلص ندا فاضلی اختیار کیا۔

ندا فاضلی کے بڑے بھائی مصطفیٰ حسن جنھوں نے ندا فاضلی کا نام مقتدیٰ حسن

رکھا تھا پاکستان شپنگ کارپوریشن میں جنرل منیجر کے عہدے پر فائز تھے۔ چھوٹے بھائی صبا فاضلی تھے جو مشاعروں میں اپنے ترنم کی وجہ سے کافی مقبول تھے۔ تسلیم فاضلی بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے اور پاکستان فلم انڈسٹری میں نغمہ نگار رہے۔

ندؔا فاضلی کے والد مرتضٰی حسن دعاؔ ڈبائیوی کا انتقال 9 جنوری 1985ء کو کراچی پاکستان میں ہوا۔ جب ان کے والد کا انتقال ہوا تو اس وقت ہندوستان اور پاکستان کے درمیان سرحد پر ماحول کشیدہ تھا جس کی وجہ سے ندؔا فاضلی اپنے والد کے جنازے میں شامل نہیں ہو سکے۔ اپنے والد کی موت کا ہر انسان کو غم ہوتا ہے اور وہ اپنے طریقے سے اس غم کا اظہار بھی کرتا ہے اور دل کو تسلی دینے کی کوشش کرتا ہے۔ ندؔا فاضلی نے بھی اپنے والد کی موت کے غم اور جنازے میں شریک نہ ہونے کے غم کو اپنی شاعری کے ذریعے ہلکا کرنے کی کوشش کی اور والد کے نام ایک نظم لکھی جس کا عنوان ''والد کی وفات پر'' ہے۔

تمہاری قبر پر
میں فاتحہ پڑھنے نہیں آیا
مجھے معلوم تھا
تم مر نہیں سکتے
تمہاری موت کی سچی خبر جس نے اڑائی تھی
وہ جھوٹا تھا۔

اس نظم کے آخری حصے میں ندا فاضلی نے جس درد کا اظہار پیش کیا ہے وہ واقعی محسوس کرنے کے قابل ہے:

تمہاری قبر پر جس نے تمہارا نام لکھا ہے
وہ جھوٹا ہے
تمہاری قبر میں میں دفن ہوں
تم مجھ میں زندہ ہو
کبھی فرصت ملے تو فاتحہ پڑھنے چلے آنا

یہ نظم ان کے شعری مجموعے ''آنکھ اور خواب کے درمیان'' میں شامل ہے۔

گوالیار کا ادبی ماحول اور ندا فاضلی کے گھر پر اکثر شعری نشستوں کے ہونے سے ندا فاضلی میں شعری ذوق پیدا ہوا۔ اسی ذوق نے اُن میں شعر کہنے کا ہنر پیدا ہوا اور ان اشعار پر ریاض صاحب نے اصلاح دی۔ ریاض صاحب ندا فاضلی کے اسکول میں استاد تھے اور اسکول جاتے وقت جو موقع ندا فاضلی کو ان سے گفتگو کا اور اشعار سنانے کا ملتا تھا وہ اس سے پورا فائدہ اٹھاتے تھے۔ ندا فاضلی کے ابتدائی اشعار اس طرح کے تھے:

قدر الفت میں ستم گر نے نہ جانی میری
ہائے دل ہائے جگر ہائے جوانی میری

وفائیں تم کئے جاؤ جفائیں ہم کئے جائیں
تمہیں وہ کام آتا ہے ہمیں یہ کام آتا ہے

ندا فاضلی کا گھرانہ ابتداء سے ہی شعروادب کا گھرانہ تھا۔ ان کے خاندان میں دُعا ڈبائیوی (والد)، مخفی (والدہ)، امید فاضلی (تایازاد بھائی)، صبا فاضلی (حقیقی چھوٹے بھائی)، تسلیم فاضلی (حقیقی بھائی)، اور وسیم فاضلی (پھوپھی زاد بھائی) شاعر ہوئے ہیں۔ تسلیم فاضلی نے پاکستان فلم انڈسٹری میں خوب نام کمایا۔ ان کے یہ گیت بہت مشہور ہوئے۔

خدا کرے کہ محبت میں وہ مقام آئے
کسی کا نام لوں لب پر تمہارا نام آئے

اور:

رفتہ رفتہ وہ مری ہستی کا ساماں ہو گئے
پہلے دل، پھر دلربا، پھر دل بداماں ہو گئے

ندا فاضلی کی شاعری کا باقاعدہ آغاز اس وقت ہوا جب وہ ایک دن شام کو کسی پہاڑی پر واقع ایک مندر سے سورداس کے بھجن کو سنتے ہیں۔ بھجن کی ابتداء کچھ اس طرح سے ہے۔

مدھوبن تم کت رہت ہرے

ورہ ویوگر شیام سندر کے ٹھاڑھے کیوں نہ جرے

کون کاج کھڑے رہے بن میں، کیوں نہ اکٹی پرے

اس بھجن کو سن کر ندا فاضلی کے ذہن میں ایک انقلاب برپا ہو گیا اور انھوں نے کئی مہینے خاموشی کے بعد کئی نظمیں کہیں۔ انہی نظموں میں سے ایک نظم کے دو مصرعے ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

سائے کو چھونا سائے کو کھونا ہے

سندرتا کا پیار جنم کا رونا ہے

ندا فاضلی کی یہ نظم ماہنامہ ''سریتا'' کے اردو کے ایڈیشن میں شائع ہوئی مگر کسی وجہ سے یہ پرچہ بند ہو گیا اور ندا فاضلی کی یہ نظم گوالیار میں مذاق کا موضوع بنی۔ ہندی کے ایک طبقہ (جن میں ونود شکل، نریش سکسینہ، اوم پربھاکر، مکٹ بہاری سروج اور بھی دیگر معتبر نام شامل ہیں) نے ندا کی حوصلہ افزائی کی۔ اسی دوران ندا فاضلی نے کچھ گیت بھی لکھے جو ہندی رسالے ''دھرم یگ'' میں شائع ہوئے۔ اس رسالے کی ادارت دھرم ویر بھارتی نے کی تھی۔ یہی گیت اردو رسالے ''تلاش'' اور ''تخلیق'' میں بھی شائع ہوئے۔ ندا فاضلی وکٹوریہ کالج گوالیار میں کمیونسٹ پارٹی کی اسٹوڈینٹ فیڈریشن کے ممبر بھی رہے۔

ندا فاضلی کے بڑے بھائی مصطفیٰ حسن کا اپنے دوست سشیل کمار کی چھوٹی بہن سے معاشقہ تھا۔ جب یہ معاشقہ سماجی سرحدوں سے تجاوز کر کے جسمانی حرارتوں اور جنسی تلذز کے ساتھ سشیل کمار کی بہن کی کوکھ میں حمل کی شکل میں گھر کر گیا اور اس کے تین مہینے کے بعد مصطفیٰ حسن کے پاکستان چلے جانے کے بعد جب اس نے پریشان ہو کر یہ ساری باتیں اپنے والدین کو بتائیں، تو اس پر ہر طرف سے مشکلیں آن پڑیں۔ ندا اس معاملے میں چاہ کر بھی اس کی مدد نہیں کر سکے۔ اور اس لڑکی کے حمل کو ایک اسپتال میں جا کر ضائع کرا دیا گیا۔

جب ندا فاضلی گوالیار میں اکیلے رہ گئے تھے تو اس وقت وہ ایم اے کر رہے تھے اور ایم اے کی فیس کالج میں جمع کرنے کے لیے ان کے پاس کوئی انتظام نہیں تھا۔ اس مشکل

وقت میں ندا کے دوست بیر کمار اور ایک طوائف شیلا (جو بیر کمار کے ساتھ ہی رہتی تھی) نے مدد کی تب کالج کی فیس جمع ہو سکی۔

اپنے والد اور بڑے بھائی کی طرح ندا فاضلی کے بھی کئی معاشقے رہے۔ کبھی مِس ٹنڈن سے، کبھی حویلی والی نوکرانی کی لڑکی سے، کبھی عشرت سے۔ عشرت سے معاشقے میں ایک روز دونوں کے بیچ یہ طے پایا کہ ہم دونوں گھر سے بھاگ کر شادی کرلیں گے۔ ندا فاضلی طے وقت پر طے شدہ مقام پر نہیں پہنچے لیکن عشرت پہنچ گئی۔ عشرت کو ندا کے نہ پہنچنے سے بہت تکلیف ہوئی۔

ندا فاضلی جن دنوں بے روزگار تھے اور کھانے کے لیے بھی کچھ انتظام نہ تھا تو شانی نے ندا سے ایک سرکاری ہندی ماہنامہ میں نارائن پرشاد مہر پر ایک مضمون لکھوایا اور اسے شائع کرا دیا۔ اس کے عوض ان کو چالیس روپیے ملے ندا کئی وقت سے بھوکے تھے وہ سیدھے کھانا کھانے کے لیے ہوٹل چلے گئے۔ مگر کھانا کھاتے ہی انھیں قے ہوگئی۔ اس کے بعد انھوں نے اور بھی مضامین لکھے۔ نارائن پرشاد مہر کے بیٹے بدری پرشاد کی سفارش پر انھیں اریگیشن کے آفس میں تین مہینے کے لیے کلرک کی نوکری مل گئی۔ یہ ندا فاضلی کی پہلی نوکری تھی۔

بے روزگاری کے زمانے میں سلام مچھلی شہری نے جو کہ آل انڈیا ریڈیو سے منسلک تھے ندا کی مشاعروں میں شعر پڑھنے کے لیے بہت مدد کی۔ اس سے ان کی مالی پریشانیاں کچھ کم ہوئیں۔ اس وقت ایک شاعر کو پڑھنے کے عوض 25 روپیے ملتے تھے۔

ندا فاضلی نے علی سردار جعفری کے کہنے پر ان کے سہ ماہی ادبی رسالے ''گفتگو'' میں بھی کام کیا۔ اس میں ندا کو رسالوں کے بنڈل باندھنا، انھیں چھپوانے کے لیے پریس میں نگرانی اور بعد میں پوسٹ آفس تک لے جانا جیسے کام کرنے پڑتے تھے۔ اس کام کے لیے ندا فاضلی کو ڈیڑھ سو (150) روپے ماہوار ملتے تھے۔ جو کئی قسطوں میں ہوتے تھے۔ ندا فاضلی نے ''گفتگو'' میں صرف چھ مہینے کام کیا اور اس کے بعد ندا نے خود کو اس رسالے سے الگ کرلیا۔ ''گفتگو'' رسالے سے الگ ہونے کے بعد ندا فاضلی کو کوئی مستقل کام نہیں ملا تو انھوں نے

مشاعروں سے اور مضامین لکھنے سے جو آمدنی ہوتی تھی اسی پر اکتفا کیا۔ کچھ دن کے بعد شاہد علی خاں کے توسط سے ندا فاضلی کو مکتبہ جامعہ میں ایک کام مل گیا جو صرف دن میں ایک گھنٹے کا ہوتا تھا اور اس کے عوض ندا فاضلی کو 204 روپے ماہوار ملنے لگے۔ یہ رقم انھیں ہر ہفتے 51 روپے کی قسط میں ملتی تھی۔ اس سے ندا فاضلی کی آمدنی میں اضافہ ہوا۔

ندا فاضلی ممبئی آکر کبھی کھولی میں رہے کبھی کسی جاننے والے کی مہربانی سے اس کے ساتھ کسی کمرے پر رہے اور کبھی خود کرایے پر کمرہ لے کر رہے۔ ممبئی میں آکر انھوں نے بہت مشکلات کا سامنا کیا۔ جب ندا فاضلی پہلی مرتبہ گوالیار سے ممبئی آئے تھے تو ان کے پاس اکیس روپیوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ ممبئی جیسے شہر میں رہنے کے لئے اکیس روپیے کے کوئی معنی نہیں لیکن وقت کو کون بدل سکا ہے۔

ندا فاضلی کے پاس جب کچھ پیسہ جمع ہو گیا تو انھوں نے ممبئی کے کھار میں ایک زیر تکمیل بلڈنگ میں کچھ پیشگی رقم دے کر ایک فلیٹ بک کرالیا۔ یہ انھوں نے وٹھل بھائی کے کہنے پر بک کرایا تھا۔ وٹھل بھائی ایک موروثی رئیس تھے جو مدھیہ پردیش میں ایک ساگر نامی جگہ پر رہتے تھے۔ ان کا بیڑی کا کاروبار اچھا خاصا پھیلا ہوا تھا جو اس وقت 27 نمبر بیڑی کے نام سے مشہور تھا۔ اس سے کافی حد تک منافع ہوتا تھا۔ ان کے مختلف شوق تھے، جن میں ایک شوق یہ بھی تھا کہ وہ شاعری سے رغبت رکھتے تھے جس کی وجہ سے وہ ندا فاضلی کے قریب ہو گئے اور کئی مواقع پر انھوں نے ندا فاضلی کی مدد بھی کی۔ جب ندا فاضلی نے یہ فلیٹ بک کرالیا تو اب انھیں اپنی آمدنی کے ذرائع بڑھانے کی فکر ہوئی۔ اس دوران انھوں نے جن فلموں کو وہ پسند نہیں کرتے تھے ان میں صرف پیسوں کی خاطر کام کیا۔ جب فلیٹ بن کر تیار ہو گیا تو وہ اس میں منتقل ہو گئے۔ اس فلیٹ میں آنے سے پہلے وہ ریلوے کے سرکاری کوارٹر کے کمرے میں رہ رہے تھے۔

ندا فاضلی پر گوالیار میں بھی اور ممبئی میں بھی کئی مرتبہ ایسا وقت بھی آیا کہ انھیں دوسرے کے ٹفن پر گزارا کرنا پڑا۔ اگر کوئی انھیں اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر لیتا تھا تو وہ کھانا کھا لیتے تھے ورنہ دوسرے وقت کے لیے منتظر رہتے تھے۔

جب ممبئی میں ندا فاضلی کا اپنا گھر ہو گیا تو عشرت کے ماں باپ نے ایک روز ممبئی

آ کر ندا فاضلی اور عشرت کی منگنی کر دی لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ اس منگنی میں عشرت موجود نہیں تھی۔ ندا فاضلی نے اس رشتے کو دل سے نہ چاہتے ہوئے بھی نبھانے کی بھرپور کوشش کی لیکن عشرت ہر بار ناکام رہی۔ عشرت کا ندا فاضلی سے نکاح بھی ہوا مگر یہ صرف رسمی طور پر ہی رہا اور معاملہ عشرت کی طرف سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ یہ بات ابھی تحقیق طلب ہے کہ آخر ایسا کیا الجھاؤ تھا جو عشرت کو ندا فاضلی تک آنے میں روکے ہوئے تھا۔ عشرت اور ندا فاضلی کے نکاح میں صبا فاضلی، اوشا کھنہ اور فلم ایکٹرس تبسم شامل ہوئے۔

اس نکاح کے بعد جب ندا فاضلی کو یہ محسوس ہوا کہ معاملہ کامیاب ہونے والا نہیں تو وہ مالتی جوشی سے اپنی قربتیں بڑھانے لگے۔ مالتی جوشی گجراتی فلموں کی مشہور اداکارہ تھیں۔ جب ندا فاضلی کی مالتی جوشی سے پہلی ملاقات ہوئی تو وہ اپنی آواز میں غزلیں ریکارڈ کرنا چاہتی تھیں اور ان کا ندا سے ملنے کا مقصد ان کی چند غزلیں لینے کا تھا۔ اسی سلسلے میں ملاقاتیں بڑھنے لگیں۔

اسے اتفاق کہیے یا کچھ اور، ندا فاضلی اسی دوران اپنی بیماری کے علاج کے لیے اسپتال میں داخل ہوئے تو ان کی ساری دیکھ بھال مالتی جوشی نے بڑی اپنائیت کے ساتھ کی۔ ندا سے مالتی کی قربتوں کی خبر جب مالتی کے گھر پہنچی تو ان کے گھر والے ان سے بہت خفا ہوئے اور وہ اس کی مخالفت پر اتر آئے۔ لیکن مالتی نے ان کی باتوں کو نہیں مانا اور ایک روز وہ اپنے ساتھ کچھ کپڑے لیکر ندا فاضلی کے گھر آ گئیں۔ اور دونوں بیوی شوہر کی طرح رہنے لگے۔ کچھ دن کے بعد جب ان کے اس رشتے کی خبر چاروں طرف پھیلی تو لوگ طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔ مالتی جوشی نے اسی دوران کورٹ میرج کرنے کا ارادہ کیا اور وہ اس کے لیے کورٹ سے فارم بھی لے آئیں۔ مگر یہ بھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا اور یہ رشتہ آخر تک اسی طرح چلتا رہا۔

ندا فاضلی کے یہاں 1999 میں ایک بیٹی کی پیدائش ہوئی جس کا نام انھوں نے تحریر فاطمہ رکھا لیکن یہ نام کچھ روز کے بعد فاطمہ سے فاضلی ہو گیا اور وہ تحریر فاضلی کہلانے لگیں۔ آج کل مالتی جوشی اور تحریر فاضلی ممبئی میں مقیم ہیں۔ تحریر فاضلی ممبئی کے کملا دیوی انٹر کالج میں گیارہویں کلاس میں تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ ندا فاضلی کے ممبئی آنے سے پہلے ان کے بھائی صبا فاضلی ممبئی میں رہتے تھے اور انھوں نے ایک فلم بھی بنائی

تھی مگر وہ ناکام ثابت ہوئی۔ اسی دوران انھیں اس فلم کی ہیروئن سے عشق ہو گیا جو کہ اپنے انجام کو نہ پہنچ سکا کیونکہ ان کی ماں ممبئی آکر صبا فاضلی کو اپنے ساتھ پاکستان لے گئیں۔ ندا فاضلی کی والدہ جمیل فاطمہ کی یہ دلی خواہش تھی کہ ندا فاضلی پاکستان چلے آئیں اور وہ اپنے سبھی بچوں کو اپنے پاکستان کے گھر میں ایک ساتھ دیکھ لیں لیکن ان کی یہ حسرت پوری نہ ہو سکی۔ ندا فاضلی پاکستان جمیل فاطمہ کے انتقال کے بعد جب پہنچے تو وہ کراچی ایئرپورٹ سے گھر نہ جا کر سیدھے اپنی ماں کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گئے، اس کے بعد گھر پہنچے۔ اس سفر کے بعد انھوں نے پاکستان کے کئی سفر کیے۔

ندا فاضلی کا انتقال 8 فروری بروز پیر 2016 کو اپنے گھر ممبئی میں ہوا اور انھیں ممبئی کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ اس وقت ندا فاضلی کا کوئی بھی رشتہ دار وہاں موجود نہیں تھا۔ ان کی آخری رسومات ان کی بیوی، بیٹی اور ان کے کچھ دوستوں نے ادا کیں۔

مالتی جوشی (ان کی بیوی) نے بتایا کہ جب وہ صبح کو حسبِ معمول اپنے وقت پر بستر سے نہیں اٹھے تو وہ انہیں جگانے کے لیے گئیں۔ ان کے ہلانے پر انھوں نے کوئی حرکت نہیں کی تو مقامی ڈاکٹر کو بلوایا گیا اور ڈاکٹر نے انھیں مردہ قرار دے دیا۔

9 فروری 2016 کو ہندوستان کے مختلف اخباروں میں ان کی موت کی خبر شائع ہوئی۔ ہندوستان کے وزیر اعظم جناب نریندر مودی نے اپنے غم کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔

> ''ندا فاضلی صاحب اب ہمارے بیچ نہیں رہے۔ لیکن ان کی شاعری اور سنیما اور نثر میں ان کی خدمات ہمیشہ ہمارے درمیان رہیں گے۔ ان کا نہ رہنا سچ مچ بیحد افسوس ناک ہے'' ۔[۴]

کانگریس کی قومی صدر محترمہ سونیا گاندھی نے بھی اپنے غم کا اظہار ان تعزیتی جملوں میں کیا۔

> ''ساہتیہ اکادمی اور پدم شری انعام یافتہ شاعر کو ان کی خدمات کے لیے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا جس نے ایک پوری جنریشن کو افتخار بخشا'' ۔[۵]

فلمی دنیا نے بھی اپنے انداز میں انھیں خراج تحسین پیش کیا۔ لتا منگیشکر نے اس انداز میں اپنے غم کا اظہار کیا۔

''آج مشہور شاعر ندا فاضلی صاحب کا انتقال ہوا اس بات کا مجھے بہت دکھ ہے۔ اللہ انھیں جنت عطا فرمائے۔ یہ میری دلی دعا ہے'' ؀

ندا فاضلی نے ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری کی۔ ندا فاضلی کا سب سے پہلا شعری مجموعہ ''لفظوں کا پُل'' ہے جو 1949 کو رحیمی پریس دہلی سے شائع ہوا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن 1998 کو شائع ہوا۔ ''مورناچ'' دسمبر 1978 کو شائع ہوا۔ ''آنکھ اور خواب کے درمیان'' پہلی بار دسمبر 1986 کو لبرٹی آرٹ پریس پٹودی ہاؤس دریا گنج دہلی سے شائع ہوا۔ ''کھویا ہوا سا کچھ'' 1996 میں شائع ہوا، اسی مجموعے پر ندا فاضلی کو ساہتیہ اکادمی انعام ملا۔ ''شہر میرے ساتھ چل'' 2004 میں شائع ہوا۔ ''زندگی کی طرف'' 2007 کو شائع ہوا۔ اصل میں ندا فاضلی نے اس کا نام ''زندگی کی تڑپ'' رکھا تھا لیکن پبلیشر سے ہوئی فون پر گفتگو میں پبلیشر نے ''تڑپ'' کو ''طرف'' سمجھ لیا، اور یہ اسی نام سے منسوب ہوگیا۔ ''زندگی کی طرف' کے نام سے حنفی صاحب کا ایک دوہوں کا مجموعہ بھی ہے۔

''شہر میں گاؤں'' جو ندا فاضلی کا کلیات ہے 2012 میں اصیلہ آفسیٹ پرنٹرز، دہلی سے بہ اہتمام شاہد ماہلی شائع ہوا اس میں ان کا منتخب کلام ہے جو 662 صفحات پر مشتمل ہے۔ ندا فاضلی کا آخری مجموعہ ''سب کا ہے ماہتاب'' ہے جو 2014 میں شائع ہوا۔

شاعری کے علاوہ ندا فاضلی نے نثر میں بھی طبع آزمائی کی اور ان کے دو سوانحی ناول شائع ہوئے، جس میں سب سے پہلے ''دیواروں کے بیچ'' نومبر 1992 میں عزیز پرنٹنگ پریس دہلی سے شائع ہوا۔ اس کی کتابت جناب عبدالرشید بھاگل پوری نے کی تھی۔ ان کا دوسرا سوانحی ناول ''دیواروں کے باہر'' (یادداشتیں) شائع ہوا۔ اس کے ناشر ایم آر پبلیکیشنز نئی دہلی ہیں۔ یہ ندا فاضلی کی آخری تصنیف تھی۔ ایک تنقیدی مجموعہ ''ملاقاتیں'' کے عنوان سے 1986 میں شائع ہوا۔ اس کی اشاعت سے قبل ممبئی میں اس کا اشتہار کے ذریعے

Advertisement کیا گیا۔

''چہرے'' جو خاکوں کا مجموعہ ہے 2002 میں شائع ہوا تھا، اس میں شعراء کے خاکے ہیں۔ ''دنیا میرے آگے'' 2009 میں شائع ہوا۔ ''چہرے'' میں شاعروں کے خاکے ہیں۔

ندا فاضلی کو بہت سے انعام و اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ حکومت ہند نے 2013 میں ان کو ''پدم شری ایوارڈ'' سے نوازا۔ ایوانِ غالب نے ''غالب ایوارڈ'' سے نوازا۔ ان کے شعری مجموعے ''کھویا ہوا سا کچھ'' پر 1998 ساہتیہ اکادمی انعام دیا گیا۔

نثری تصنیف ''ملاقاتیں'' پر ساہتیہ پریشد ایوارڈ دیا گیا۔ ندا فاضلی نے نغمہ نگاری میں بھی نام روشن کیا اور فلم ''سر'' کے بہترین نغمہ نگار کے لیے 2003 میں اسٹار اسکرین ایوارڈ سے نوازے گئے۔

فلمی دنیا میں ندا فاضلی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اردو کے مشہور شاعر اور نغمہ نگار جاوید اختر ان کے اچھے دوست تھے اور جگجیت سنگھ سے تو ان کے ذاتی تعلقات تھے۔ انھوں نے ندا فاضلی کی بہت سی غزلیں گائیں۔ جن میں ''ہر طرف ہر جگہ بے شمار آدمی'' بہت مشہور ہوئی۔

''ہندی کے روزنامہ ''ہندوستان'' 9 فروری بروز منگل 2016 نئی دہلی'' میں کہانی کار دھیریندر استھانہ سے بات چیت پر مبنی ایک واقعہ میں یہاں پیش کرنا چاہوں گا۔ شاید وہ 1990ء کے نومبر ماہ کی بات ہے۔ دھیریندر ایک رات کو کھار میں واقع ندا فاضلی کے گھر گئے انھوں نے دروازے پر دستک دی دروازہ کھلتے ہی ندا فاضلی باہر آئے، دھیریندر نے اپنا نام بتایا۔ نام سنتے ہی ندا فاضلی نے کہا ''پھاڑ دو'' وہ بوکھلا گئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ انکا تکیہ کلام ہے۔ وہ کسی ترقی پسند بات پر اپنا ردعمل ایسے ہی ظاہر کرتے ہیں۔

ہندی میں بھی ان کے کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ''مورناچ''، آنکھ بھرا آکاش''، ''کھویا ہوا سا کچھ''، ''شہر میں دھوپ'' اور ''ہم قدم''۔

ندا فاضلی کا سوانحی ناول ''دیواروں کے بیچ'' ابتداء میں ممبئی سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''شاعر'' میں قسط وار شائع ہوا۔ ان کی اس آپ بیتی کو بہت سراہا گیا۔ ماہنامہ ''شاعر'' میں چھپے ہوئے خطوط سے ندا فاضلی کے اس ناول کے بارے میں ادباء و شعراء

نے جو آراء قائم کی ہیں ان میں کچھ آراء یوں ہیں :

''ندا فاضلی کی خودنوشت کافی دلچسپ ہے'' ڈاکٹر جمیل جالبی

''ندا فاضلی کی ''دیواروں کے بیچ'' بڑے دلچسپ انداز میں چل رہی ہے۔ ان کے اسلوب نگارش او ران کی اچھوتی طبیعت دونوں نے یکجا ہوکر انفرادیت قائم کردی ہے''۔ (شہپر رسول)

ندا فاضلی کے سوانحی ناولوں سے متعلق ایک اقتباس پیش ہے:

''اردو میں سوانح کی اساس پر ناول لکھنے کا اسلوب ادب میں تازہ ہوا کے جھونکے کے مانند قریۂ جاں کو معطر کرنے کا وسیلہ ثابت ہوتا ہے۔ ''کارِ جہاں دراز ہے'' کی اشاعت کے بعد ندا فاضلی نے ''دیواروں کے بیچ'' اور ''دیواروں کے باہر'' جیسے آپ بیتی کا رنگ لیے سوانحی ناول لکھ کر اردو ادب کی ثروت میں اضافہ کیا''۔ [7]

اسی سلسلے میں آگے غلام ابن سلطان لکھتے ہیں:

''عبداللہ حسین نے اپنے ناول ''باگھ'' میں تجریدیت کو زادراہ بنایا ہے جب کہ ندا فاضلی نے اپنے سوانحی ناولوں میں تجسیم کو مرکز نگاہ سمجھا ہے۔ ندا فاضلی کے اسلوب میں ان کی فراخ حوصلگی۔ وسیع النظری اور عالی ظرفی قاری کو ایک نئے آہنگ سے متعارف کراتی ہے''۔ [8]

ندا فاضلی نے فلمی دنیا میں آنے کے بعد خوب نام کمایا۔ انھوں نے 33 سے زیادہ فلموں میں نغمے لکھے۔ اس کے علاوہ بہت سی فلموں کے کامیاب مکالمے بھی لکھے جن میں ''قلم'' اور ''یاترا'' کے مکالمے کافی مشہور ہیں۔ انھوں نے جو نغمہ نگاری کی ان میں سے کچھ فلموں کے نام حسب ذیل ہیں۔

''رضیہ سلطان، سُر، گڑیا، آپ تو ایسے نہ تھے، اس رات کی صبح نہیں، سرفروش، یاترا، ہرجائی، وجے، دیو، انوکھا بندھن، تمنا۔''
ان کے نغمے بھی بہت مشہور ہوئے جیسے :۔

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کہیں زمیں تو کہیں آسماں نہیں ملتا

تو اس طرح سے مری زندگی میں شامل ہے
جہاں بھی جاؤں تو لگتا ہے تیری محفل ہے

ندا فاضلی کی نغمہ نگاری سے متعلق گفتگو اس کتاب کے آخری باب میں ہوگی ۔آخر میں ندا فاضلی کا ایک خاکہ پیش ہے۔

نام : مقتدا حسن
قلمی نام : ندا فاضلی
پیدائش : 12 اکتوبر 1938 دہلی
وفات : 8 فروری 2016 بروز پیر ممبئی
تعلیم : ایم۔اے (اردو، ہندی) 'اجین'
تصانیف :

اردو

لفظوں کا پل (شاعری) 1971، مکتبہ جامعہ، دہلی
☆ مورناچ (شاعری) 1978 ☆ آنکھ اور خواب کے درمیان (شاعری) 1986 ☆ کھویا ہوا سا کچھ (شاعری) 1996 ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ، 140 صفحات ☆ شہر میرے ساتھ چل تو (شاعری) 2004، مکتبہ جامعہ دہلی، 121 صفحات ☆ زندگی کی طرف، 2007 نئی کتاب پبلی کیشنز دہلی، 112 صفحات ☆ کچھ اور ☆ شہر میں گاؤں (کلیات) 2012، معیار پبلی کیشن، دہلی۔

ہندی:

☆مور ناچ☆ آنکھوں بھرا آکاش☆ کھویا ہوا سا کچھ☆ سفر میں دھوپ تو ہوگی☆ ہم قدم☆ندا فاضلی کی شاعری (انتخاب)☆ زندگی کی طرف☆ چنندہ شاعری (گرمکھی میں انتخاب)

ترتیب وانتخاب:

داغ دہلوی، جگر مرادآبادی، جاں نثار اختر، نریش کمار شادؔ حسن نعیم، فراق گورکھپوری، احمد فراز، محمد علوی، بشیر بدر اور ندا فاضلی۔

اعزازات:

☆ پدم شری...... برائے ادبی خدمات، حکومت ہند
☆ غالب ایوارڈ......کھویا ہوا سا کچھ، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی
☆ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ......(ملاقاتیں)، دہلی
☆ اسٹار اسکرین ایوارڈ......فلم سُر (نغمہ نگار کے لیے)
☆ اتر پردیش اردو اکادمی ابوالکلام آزاد ایوارڈ۔ (پس از مرگ)
☆ جے دیال ہارمونی ایوارڈ دہلی (برائے شاعری)

اسفار:

آسٹریلیا، امریکہ، کنیڈا، برطانیہ، اٹلی، پاکستان، U.A.E اور دیگر ممالک۔

☆☆☆

حواشی

۱۔ ماہنامہ ''ایوانِ اردو'' اردو اکادمی دہلی، ص: 24، اپریل 2016

۲۔ ''دیواروں کے بیچ''، ص: 13-12

۳۔ ''دیواروں کے بیچ''، ص: 89

۴۔ ہندی روزنامہ ''ہندوستان''، 9 فروری، بروز منگل، ص: 12، نئی دہلی

۵۔ ہندی روزنامہ ''ہندوستان''، 9 فروری، بروز منگل 2016، نئی دہلی

۶۔ ہندی روزنامہ ''ہندوستان''، 9 فروری، بروز منگل 2016، نئی دہلی

۷۔ رسالہ 'اردو' ''بابِ تعزیت''، ص: 38، غلام ابن سلطان

۸۔ رسالہ 'اردو' ''بابِ تعزیت''، ص: 38، غلام ابن سلطان

باب دوم

ندا فاضلی کی نظموں کا مطالعہ

(الف) موضوعاتی مطالعہ

(ب) زبان اور اسلوب

یہ مصور عجیب ہوتے ہیں، آپ اپنے حبیب ہوتے ہیں
دوسروں کی شباہتیں لے کر، اپنی تصویر ہی بناتے ہیں
(ندا فاضلی)

الف: موضوعاتی مطالعہ

گزشتہ صفحات میں ندا فاضلی کے حالات زندگی اوران کے عہد کے سلسلے میں گفتگو ہو چکی ہے۔ اب ہمارا مقصد ان کی شاعری بالخصوص نظم نگاری سے متعلق مطالعہ پیش کرنا ہے۔ اردو شاعری غزل اور نظم میں منقسم ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دونوں میں زیادہ اہمیت کس کی ہے۔ غزل کی یا نظم کی؟ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غزل کے حصے میں جو مقبولیت آئی ہے وہ نظم کے حصے میں نہیں آئی۔ اردو کے ابتدائی زمانے میں دکن میں بہت سی نظمیں لکھی گئیں، ملا وجہی اور قلی قطب شاہ، کی نظمیں اس سلسلے میں اہم ہیں۔ شمالی ہند کے ایک مشہور شاعر فائز دہلوی کا نام بھی نظم نگاری کے سلسلے میں اہمیت کا حامل ہے۔ سودا نے ہجویہ نظمیں لکھیں۔ میر انیس نے مسدس کی ہیئت میں نظمیں لکھیں جنہیں ہم مرثیہ کے طور پر جانتے ہیں۔ مرثیہ کو میر انیس و مرزا دبیر نے درجہ کمال تک پہنچایا۔ انھوں نے مرثیوں میں اتنی وسعت سے کام لیا ہے کہ قصیدہ کا شکوہ ہو، مثنوی کا تسلسل ہو، غزل کی اشاریت اور رمزیت ہو یا ایجاز و اختصار، یا ہجو ہو، یہ سب ان کے مرثیوں میں سمٹ آئے ہیں۔ نظیر اکبر آبادی سے لے کر نظم کا یہ سلسلہ محمد حسین آزاد، حالی اور شبلی تک پہنچتا ہے۔ اس سلسلے میں انجمن پنجاب لاہور نے بھی نظم کے فروغ میں اہم کارنامہ انجام دیا۔ اقبال نے نظموں میں فلسفہ پیش کیا۔ نظموں کو جوش و جذبہ جوش ملیح آبادی نے عطا کیا۔ ساتھ ہی سیماب اکبر آبادی،

حفیظ جالندھری، احسان دانش، جمیل مظہری، ساغر نظامی، اختر شیرانی کے نام بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ نظم کا یہ کارواں آگے بڑھ کر ترقی پسندی اور جدیدیت کے پیکر میں ڈھلا جس کے اہم شعراء میں ن۔م۔ راشد، قیوم نظر، یوسف ظفر، میرا جی، سلام مچھلی شہری، اختر الایمان، مجید امجد، فیض احمد فیض، جذبی، مجاز، جاں نثار اختر، سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی شامل ہوئے پھر ان میں خلیل الرحمٰن اعظمی، شہریار، مجروح سلطان پوری، بلراج کومل، مظہر امام، باقر مہدی، شاذ تمکنت، محمد علوی، عمیق حنفی، زبیر رضوی کے نام بھی جڑ جاتے ہیں۔ ندا فاضلی اس کارواں کے اہم اور منفرد شاعر ہیں۔

ندا فاضلی کی نظموں سے متعلق گفتگو کرنے سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ شاعری کسے کہتے ہیں۔ وہ کلام جس کو پڑھتے وقت زبان کو لکنت نہ ہو، طبیعت پر گراں نہ گزرے بلکہ ایک دلکشی پیدا ہو جائے اور دل پر ایک طرح کا اثر قائم کرے ساتھ ہی وہ انسان کے جذبات کو متحرک کرے شاعری کے زمرے میں آتا ہے۔ شاعری کا ایک اہم جزو جذبات ہے۔ بغیر جذبات کے ہم شاعری کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ دنیا میں تمام رشتے چاہے خون کے رشتے ہوں، انسانی ہمدردی ہو، خوشی ہو، غم ہو یا درد ہو، ان سب کا تعلق جذبات سے ہے۔ اگر ان میں جذبات کارفرما نہ ہوں تو یہ سب بے کار ہیں اس لئے جذبات شاعری کا جز و لاینفک ہے۔ صفی لکھنوی کا ایک شعر شاعری اور جذبات کے رشتے کو سمجھنے کے لیے پیش ہے۔

شاعری کیا ہے؟ دلی جذبات کا اظہار ہے
دل اگر بے کار ہے تو شاعری بے کار ہے

سائنس کی دنیا میں عظیم فلسفی و سائنسداں چارلس ڈارون نے بھی شاعری سے متعلق اپنی سوانح میں شاعری کی اہمیت واضح کی ہے، میں ان کا طویل اقتباس تو یہاں پیش نہیں کر سکتا۔ لیکن ان کے شاعری سے متعلق تاثرات کو یہاں پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ انھیں اپنی زندگی کے ابتدائی دنوں میں شاعری سے بہت دلچسپی تھی۔ اس دلچسپی کو شیکسپیر کے کلام کے مطالعے نے اور زیادہ تقویت بخشی، لیکن کسی وجہ سے وہ اس طرف خاطر خواہ توجہ نہ دے سکے۔

کیونکہ وہ ''مسئلہ ارتقا'' کی گتھیوں کو سلجھانے میں لگ گئے۔ انہیں اس طرف توجہ دینے کا وقت ہی میسر نہ ہوا۔ آخر میں انھوں نے یہ محسوس کیا کہ ان کے تمام احساسات مر چکے ہیں اور ان کے دماغ کے کچھ حصے مردہ ہو چکے ہیں جن سے مسرت بہم پہنچتی تھی۔ ڈارون کے انھیں خیالات سے امریکہ کے مشہور ماہر نفسیات پروفیسر جیمس نے اتفاق کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> ''ڈارون کے اس بیان سے لوگوں کو سبق لینا چاہیئے اور ہر شخص کو کم سے کم دس منٹ روز شعر و شاعری کے لیے وقف کر دینا چاہیئے تاکہ جذبات مردہ نہ ہونے پائیں''۔ (بحوالہ ''ہماری شاعری ،معیار و مسائل'' سید مسعود حسن رضوی ادیب ص:35-36)

شاعری کی اہمیت سے متعلق پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کا ایک اقتباس پیش ہے:

> ''شاعری بے حس قوتوں کو چونکاتی ہے، سوتے احساس کو جگاتی ہے، مردہ جذبات کو جلاتی ہے، دلوں کو گرماتی ہے، مصیبت میں تسکین دیتی ہے، مشکل میں استقلال سکھاتی ہے، بگڑے ہوئے اخلاق کو سنوارتی ہے اور گری ہوئی قوموں کو ابھارتی ہے''۔ (ہماری شاعری، ص:۳۷)

شاعری کے اوصاف پر نظر کرتے ہوئے اب یہ دیکھنا ہے کہ آخر کلام میں وہ کون سی خوبیاں یا خصوصیات ہوتی ہیں جو اسے کبھی غزل ، کبھی مرثیہ ، کبھی مثنوی بناتی ہیں، کبھی قصیدہ کبھی قطعہ کبھی رباعی اور کبھی نظم بناتی ہیں۔ میں نے ان خصوصیات کو اپنے طور پر سمجھنے کی کوشش کی ہے اور ان خصوصیات کا اطلاق صرف نظم پر ہوتا ہے کیونکہ میرا موضوع نظم نگاری ہی ہے۔

فیروز اللغات اردو جدید میں نظم کے معنی (مؤنث) لڑی، سلک، موزوں کلام، شعر، (مذکر) بندوبست، انتظام کے ہیں۔

لڑی سے مراد یہ ہے کہ شاعر نظم میں اپنے خیالات کو ایک تسلسل کے ساتھ پیش کرتا ہے اور بات کو اس طرح آگے بڑھاتا ہے کہ وہ واضح ہوتی چلی جاتی ہے۔ جس طرح ایک لڑی میں موتیوں کو ترتیب سے پرو دیا جاتا ہے اور وہ ایک مالا کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ شاعر بھی اپنے خیالات کو نظم میں پیش کرتے ہوئے بندوبست کرتا ہے، وہ اپنے خیالات کو صفحہ قرطاس پر ابھارنے سے پہلے اپنے ذہن میں اس کا ایک نقشہ بناتا ہے، تب جا کر وہ اسے عملی جامہ پہناتا ہے اسے ہم بندوبست سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

انگریزی ڈکشنری آکسفورڈ انگلش ہندی ڈکشنری میں نظم Poem کے معنی اس طرح دیئے ہیں:

"A piece of writing arranged in short lines. Poems try to express thoughts and feelings with the help of sound rhythm."

انگریزی میں نظم کی تعریف اس معنی میں نہیں ہے جس معنی میں ہم نظم کو دیکھ رہے ہیں بلکہ یہ تعریف شاعری کے لئے دی گئی ہے۔ جس میں تمام اصناف شاعری شامل ہیں۔ اب چاہے غزل ہو، قصیدہ ہو، رباعی ہو، مرثیہ ہو یا مثنوی ہو۔ نظم کے تعلق سے شمس الرحمٰن فاروقی کا کہنا ہے:

"ہر وہ منظوم تحریر جو غزل نہیں ہے وہ نظم ہے۔ یہاں میں نثری نظم کو منظوم تحریر کی نوع میں رکھ رہا ہوں اور اگر کوئی ڈرامہ منظوم ہے یا اس کے کچھ حصے منظوم ہیں تو ان منظوم حصوں کی حد تک وہ ڈراما بھی نظم ہے۔ دوسرا اصول یہ ہو سکتا ہے کہ نظم وہ منظوم تحریر ہے جو غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، رباعی، قطعہ، واسوخت، شہر آشوب، مسمط، ترکیب بند، ترجیع بند، مستزاد نہ

ہو۔''۲؎(تنقیدی افکار۔شمس الرحمٰن فاروقی ،ص:162)

۔شمس الرحمٰن فاروقی کا ایک اور اقتباس دیکھئے جو نظم کی تعریف کو واضح طور پر سمجھنے میں معاون ثابت ہوگا۔

''ہر وہ منظومہ جو غزل نہیں ہے، نظم ہے اور نظم کی بنیادی صنعت وحدت ہے، جس کا ایک تغافل ربط و تسلسل ہے۔یہ ربط و تسلسل کئی طرح کا ہوتا ہے اور ہر نظم کے ساتھ اور ہر قسم کی نظم کے ساتھ بدلتا بھی رہتا ہے۔'' ۳؎(تنقیدی افکار :ص:177)

جب کہ مسعود حسن رضوی ادیب کا کہنا ہے کہ:

''لفظوں کا وہ مجموعہ جس میں موزونیت کی صفت پائی جائے ،مصرع کہلاتا ہے اور مصرعوں کا وہ مجموعہ جس میں تسلسل یا معنوی ربط پایا جائے نظم کہلاتا ہے۔'' (ہماری شاعری:ص45)

اب تک ہم نے شاعری اور نظم سے متعلق گفتگو کی اب اس عہد کے رجحانات پر نظر ڈالتے ہیں۔ترقی پسند تحریک کے زوال یعنی 1956ء کے بعد موضوعات میں اضافہ ہوا اور جدید رجحان کو فروغ ہوا اور انقلابی آہنگ کو اردو شاعری میں خاص طور پر نظموں میں اپنایا جانے لگا۔لفظ ''جدید'' کے لغوی معنی سے بھرپور استفادہ کیا گیا اور نئی نئی ترکیبوں ،علامتوں کا استعمال کیا جانے لگا۔اب وہ زمانہ آگیا تھا کہ شاعروں نے جن چیزوں کا مشاہدہ خود اپنی آنکھوں سے کیا اسی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔سنی سنائی باتوں کو انھوں نے رد کرکے اپنی شاعری کو زندگی کی حرارت عطا کی جس سے شاعری میں وسعت پیدا ہوئی۔اگر سچ کہا جائے تو وہ یہ ہے کہ ہر تحریک اور رجحان اپنے دور کی ضرورت ہوتا ہے اور اس سے شعروادب میں اضافہ ہوتا ہے،لیکن ہمیں یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ ایک ہی تحریک یا رجحان کو ہم ہر دور کے ادباء یا شعراء پر نہیں تھوپ سکتے۔

علی گڑھ تحریک ، ترقی پسند تحریک ، حلقہ ارباب ذوق ، جدیدیت ہو یا مابعد جدیدیت ، یہ سبھی تحریکیں اپنے اپنے وقت کی ضرورت تھیں ۔ اب ہم علی گڑھ تحریک ہی کو لیتے ہیں ۔ اس تحریک کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں میں عظمت وطن جاگ اٹھی اور انھوں نے اپنے کھوئے ہوئے وقار کو پانے کے لیے جی جان سے محنت کی اور آخر میں وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے ۔ جب اس تحریک کا مقصد پورا ہوگیا تو ظاہر بات ہے کہ اب اس کی اہمیت وہ نہ رہ سکتی تھی جو پہلے تھی ۔ پھر اس کے بعد ترقی پسند تحریک کا ذکر ضروری ہے کیونکہ علی گڑھ تحریک نے لوگوں میں غلامی کی زنجیریں توڑنے کا جذبہ پیدا کر دیا تھا اور مسلمانوں نے اپنے وقار اور عظمت کو پہچان لیا تھا اور اب وہ تعلیم کے میدان میں آگے آرہے تھے ۔ اب ضرورت تھی اس جذبے اور جوش کو عملی جامہ پہنانے کی جس کو ترقی پسند تحریک نے انجام دیا ۔ شعراء و ادباء نے صاف طور پر جبر و استحصال کو اپنی تخلیقات میں پیش کرنا شروع کر دیا ۔ اس کے صلے میں وہ جیل بھی گئے اور آخرش وطن آزاد ہوگیا ۔ شاید یہی مقصد تھا جو 1956 کو سجاد ظہیر نے اس تحریک کے خاتمے کا اعلان اس طرح کیا :۔

> ”ترقی پسند تحریک جس مقصد کے لیے وجود میں آئی تھی وہ مقصد تقریباً پورا ہوگیا ہے اور ترقی پسند تحریک اپنا تاریخی رول ادا کر چکی ہے اب اردو کے ادیبوں کی ایسی تنظیم کی ضرورت ہے جس میں ہر نقطۂ خیال رکھنے والے ہوں ۔“[۱۱]

1955 کے بعد سے ہی نظم میں خارج سے باطن کی طرف سفر ہونے لگا ۔ اس دور میں غم ، تنہائی ، ڈر ، وحشت ، نا اُمیدی اور بے کسی کا نظموں میں در آنا فطری تھا ۔ اسی لیے نظموں کے اسلوب میں بھی بدلاؤ آیا ۔ اس میں استعارات اور علامتیں اپنے احساس و جذبات کے اظہار کے لیے استعمال ہونے لگیں ۔ اسی جدت طرازی (جدیدیت) کے رجحان کے سبب شاعری کے اسلوب میں ایک تغیر پیدا ہوگیا ۔ اسی سے متعلق گوپی چند نارنگ کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو :

> ”اردو میں واضح طور پر یہ فرق ترقی پسندی اور جدیدیت

کے ادب میں ملتا ہے۔ ترقی پسند ادب جو حقیقت پسند
ادب ہے بالعموم انسلا کی پیرایۂ اظہار اختیار کرتا
ہے۔ (بہ استثنائے چند) جس میں زور وضاحت پر
ہے۔ اس کے برعکس جدیدیت کا ادب بنیادی طور
پر استعاراتی ہے ان دونوں رویوں میں کشمکش عملی
اور ردِ عمل کا رشتہ ہے جس کی کارفرمائی برابر دیکھی
جاسکتی ہے''۔[۲۲]

اصل میں جدیدیت کا جو رجحان تھا وہ ترقی پسندی کا ردعمل تھا اور ساتھ ہی اس وقت کے شعراء و ادباء کے موضوعات اور اسلوب میں بھی تبدیلی آرہی تھی اور اسلوب وموضوعات میں اس تبدیلی کی وجہ وہ روش تھی جو ترقی پسندوں کے یہاں شدت سے جاری تھی۔

یہ ردعمل یا ترقی پسندی سے انحراف جان بوجھ کر نہیں کیا گیا بلکہ اس وقت کے حالات اور تقاضے ہی ایسے تھے کہ انھیں پرانے سانچے میں ڈھالا نہیں جا سکتا تھا۔ لہٰذا اس کے لیے نئے اور تازہ خیالات اور الفاظ کی تلاش کی گئی کیوں کہ ضرورت کھوج کی ماں ہے۔ اسی لیے نئے خیالات کو نئے الفاظ اور نئے اسلوب کے ساتھ شعراء نے اپنایا۔ یہیں سے جدیدیت کا آغاز ہوا۔

ندا فاضلی کا تخلیقی سفر جس دور میں شروع ہوا وہ ذہنی انتشار کا دور تھا۔ انسانی قدروں کی پامالی، خونریزی اور بے بسی، چاروں طرف پامال منظر، انسان کا خود کو غیر محفوظ محسوس کرنا، وطن کا بٹوارہ، اپنی جڑوں سے اکھڑ کر اجنبی جگہوں کو اپنا مسکن بنا لینے پر مجبور ہونا، اپنوں سے بچھڑنے کا غم، بے سروسامانی یہ سب اس دور کی پہچان تھے۔ ان تمام معاملات وحادثات سے ان کی نظموں کا خمیر تیار ہوا۔ ندا فاضلی کا تجربہ اور مشاہدہ عمیق اور وسیع ہے۔ اس تجربے اور مشاہدے سے انھوں نے اپنی شاعری بالخصوص نظموں میں یہ معاملات وحادثات بڑی خوش اسلوبی سے پیش کئے، یہی ان کا تخلیقی جوہر ہے۔

ندؔا فاضلی کی نظموں میں ان کی ذہنی کشمکش اور بیتے ہوئے لمحات کی یادیں اس طرح جلوہ گر ہیں کہ ہمیشہ وہ اپنی یادوں میں کھوئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری میں تصوف، فکر و فلسفہ اور جذبے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کی نظموں میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنے جذبے کو تنہائی میں بدل دیتے ہیں۔ اب یہ وہ دانستہ طور پر کرتے ہیں یا غیر دانستہ طور پر اسے حتمی طور پر بیان نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے خارجیت کو داخلیت میں سمو کر پیش کیا ہے۔ ان کی نظموں میں خیالی پیکر اور نامانوس احساسات کبھی حقیقی پیکر میں ڈھل جاتے ہیں اور کبھی غائب ہو جاتے ہیں۔ وہ ایک دھیمے لہجے کے شاعر ہیں۔ لیکن اسکا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ وہ لہجہ بے اثر ہے بلکہ وہ ایک آب و تاب اور آہنگ کے ساتھ اپنا لہجہ تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ ان کی نظمیں (بیشتر) داخلی احساسات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں، ان کے یہ داخلی احساسات وسیع ہو کر اس عہد کو اپنے اندر سمیٹ لیتے ہیں اور وہ اپنے غم کو دوسروں کے غم سے ملا کر دوسروں کے غم کو اپنا غم بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت بھی ہے کہ جب شاعر اپنی آپ بیتی کو جگ بیتی بنا کر پیش کرتا ہے تو وہ آفاقی ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی ان کی نظموں کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے ان میں اپنا عکس نظر آنے لگتا ہے۔

ندؔا فاضلی کا تخلیقی شعور، فکر و آگہی کسی کا مرہون منت نہیں ہے بلکہ انھوں نے اسے خود عصری زندگی کے مشاہدے سے حاصل کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی فکری دنیا میں انتشار نہیں ہے۔ اپنے دکھوں کو انھوں نے اپنی ذات تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اسے عصری بنا دیا ہے اور ہر انسان کے غم کو اپنا ہی غم سمجھا ہے، وہ انسان کو اپنے جیسی ہی خوشی دینا چاہتے ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں میں خیال و احساس کو جس نزاکت سے پیش کیا ہے وہ اپنے آپ میں منفرد ہے۔ ان کی نظمیں تہذیبی و ثقافتی نقوش کا مرقع پیش کرتی ہیں۔ ان کی نظموں میں زندگی کے تمام رموز اور کائنات کے وہ سبھی محرکات موجود ہیں جو اس دنیا میں ہمیں دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی شاعری باہری دکھاوے اور تصنع سے کوسوں دور ہے۔ انھوں نے جو کچھ بھی دیکھا اور محسوس کیا وہی اپنی شاعری میں ڈھال دیا۔ انھوں نے زندگی اور سماج کے اٹوٹ رشتہ کو ایک ہی دھاگے میں پرو دیا ہے اور اس دھاگے کا نام محبت رکھا

ہے۔ ان کی شاعری میں نئے موضوعات تو نہیں ہیں پرانے موضوعات کو انھوں نے نئے اسلوب میں پیش کیا ہے۔ رومان کو فکری قالب میں ڈھال کر اپنی نظم نگاری کو نئی رفتار دی اور الگ شناخت قائم کی۔

ندؔا فاضلی کا اخلاقی شعور ان کی نظموں اور دوہوں میں نظر آتا ہے جن پر ہندی بھکت شعراء کا گہرا اثر دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ ایک سیکولر ذہن کے شاعر تھے ان کی شاعری مختلف رموز سے بھری ہوئی ہے۔ وہ تخلیق پر تنقید کی برتری سے ہمیشہ نالاں رہے۔ ہندی اور اردو دونوں میں یکساں طور پر انھوں نے نام کمایا۔ انھوں نے اپنی شاعری سے اردو کو غیر اردو داں طبقے میں ایک پہچان دی۔ وہ فلمی نغمہ نگار تھے، لیکن ادبی جلسوں اور مشاعروں میں بھی ان کی ایک امتیازی حیثیت تھی ان کے دوہے بھی ایسا اثر رکھتے ہیں کہ سیدھے روح میں اُتر جاتے ہیں۔

ندؔا فاضلی کا شمار موجودہ دور کے صف اول کے شاعروں میں ہوتا ہے، ان کی شاعری، اپنے عوامی عناصر، اپنی غنائیت اور اپنے انسان دوستی رویے کی وجہ سے عوام وخواص سب میں مقبول ہے۔ وہ ایک مشترکہ تہذیبی روایت کے علاوہ اپنے قومی شعور اور ہندی اردو روایات کی آمیزش کے سبب بھی مشہور ہیں۔ ان کی نظموں میں احساس کی لطافت اور فکری طہارت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان کے اظہار کا اسلوب قاری کو مسحور کر دیتا ہے اور اسے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے، ان کی نظموں میں ہمیں نہ تو فرسودگی ملتی ہے اور نہ ہی کسی طرح کا کوئی ابہام بلکہ ان کی نظموں کا خمیر معاشرے اور عصری حسیت سے اٹھا ہے۔

ان کی شاعری میں موضوعات کے اعتبار سے تنوع ہے۔ زندگی کے مسائل اور شاعری کے جس سلسلہ پر انھوں نے زیادہ غور کیا ہے وہ ان کے کلام میں ہر جگہ منعکس ہے جس سے ان کی شاعری میں حیات کی بوقلمونی اور رنگ آمیزی نے ایک لطف پیدا کر دیا ہے۔ موضوعات کے اس تنوع میں ان کے حالات زندگی، مختلف ادوار کے مشاغل اور ان کی ذہنی کیفیات نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ جب ندؔا فاضلی کو پرسکون ماحول ملتا ہے اور ساتھ ہی وہ فراغت میں داخلی کیفیات اور خارجی مظاہر کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کی نظموں میں ان واردات و کیفیات کا عکس خوش

گوارانداز میں نظر آنے لگتا ہے۔ان کی نظموں میں مناظر قدرت کی عکاسی کے ساتھ ساتھ قدرتی مناظر سے ہم آہنگی کا احساس بھی ملتا ہے۔قید و بند کی صعوبتوں میں فکر واحساس کی کیفیتوں کا رنگ جدا ہوتا ہے اور عالم تخیل کی بلندی کلام میں رفعت پیدا کر دیتی ہے۔

ندا فاضلی کا فرقہ واریت اور تنگ نظری سے دور کا بھی کوئی رشتہ نہیں تھا۔انھوں نے جتنی بھی شاعری کی وہ کسی نہ کسی طرح قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کو مستحکم کرتی ہے۔امیر خسرو، کبیر داس، سورداس اور رس کھان کی روایت کی انھوں نے پیروی کی۔ قدرت نے انہیں قوی ذہن، دردمند دل اور دلنواز سخن سے سرفراز کیا تھا۔اس کی عمدہ مثالیں ندا فاضلی کے دوہے، غزلیں اور خاص طور سے نظمیں ہیں۔جن میں انھوں نے سوز وغم، درد اور حالات کے جبر کو بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔انھوں نے غیر مانوس الفاظ سے اجتناب کیا آسان اور سادہ علامتوں کا استعمال کر کے نظم کو دلکش بنایا ہے جس سے ان کی نظمیں دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

ندا فاضلی کے یہاں ہندی اور اردو الفاظ کا بہترین امتزاج ہے۔ہم نے ان کی نظموں کو مطالعہ کی آسانی اور ان کے شعری تصورات کے تعین کے لیے موضوع کے اعتبار سے منتخب کیا ہے۔جو حسب ذیل ہیں۔

☆ فرقہ وارانہ فسادات

☆ قومی یکجہتی

☆ سماجی اور آفاقی موضوعات

☆ گاؤں، شہر اور ہندوستانی تہذیب

☆ عشق اور رومان

☆☆☆

کوئی ہندو کوئی مسلم کوئی عیسائی ہے
سب نے انسان نہ بننے کی قسم کھائی ہے

(ندا فاضلی)

فرقہ وارانہ فسادات

ندا فاضلی کی شاعری کا سب سے بڑا وصف ان کے موضوعات کا تنوع ہے۔ انھوں نے ایسے موضوعات پر بھی نظمیں لکھی ہیں جو اردو و ادب میں ہنگامی نوعیت کی ہیں لیکن ان کی اہمیت اور معنویت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ انھوں نے گجرات کے فسادات سے لے کر اس کے بعد تک ہونے والے ہندو مسلم فسادات کو موضوع بنا کر کئی اہم نظمیں کہی ہیں، لیکن اس طرح کی نظموں میں کی گئی تخلیقی ہنر مندی کہیں بھی متاثر نہیں ہوتی اور یہی ان کے شاعرانہ اظہار کی قوت ہے۔ یہاں ایک نظم پیش ہے جو انھوں نے اس ماں کے لیے لکھی تھی جس کے سامنے اس کے چار چھوٹے معصوم بچوں کو نذر آتش کر دیا گیا تھا۔ اس نظم کا عنوان ہے ''پہچان'':

نہیں یہ بھی نہیں
یہ بھی نہیں
یہ بھی نہیں ——— وہ تو
نہ جانے کون تھے

یہ سب کے سب تو میرے جیسے ہیں
سبھی کی دھڑکنوں میں ننھے ننھے چاند روشن ہیں
سبھی میری طرح سے وقت کی بھٹی کے ایندھن ہیں

جنھوں نے میری کٹیا میں اندھیری رات میں گھس کر
مری آنکھوں کے آگے
میرے بچوں کو جلایا تھا
وہ کوئی اور تھے
وہ چہرے تو کہاں اب ذہن میں محفوظ جج صاحب!
مگر ہاں!
پاس ہوں تو سونگھ کر پہچان سکتی ہوں
وہ اس جنگل سے آئے تھے
جہاں کی عورتوں کی گود میں
بچے نہیں ہنستے

وہ زمانہ انتشار اور قتل و غارت گری کا تھا۔ جگہ جگہ بہانے بنا کر لڑائی جھگڑے ہو رہے تھے ایسا ہی ایک واقعہ جلگاؤں میں پیش آیا جہاں کچھ درندہ صفت لوگوں نے ایک ماں (جس کا نام ہاجرہ تھا) کے چار معصوم بچوں کو اپنی حیوانیت کا شکار بنایا اور اس ماں کے سامنے ہی اس کے بچوں کو جلا دیا۔ یہ سوچنے کا مقام ہے کہ اس ماں نے اپنے دل کے ٹکڑوں کو کیسے جلتے اور تڑپتے دیکھا ہوگا وہ یقینی طور پر زندہ لاش بنکر رہ گئی ہوگی۔ اس ماں کی ممتا نے ان انسانوں کے بارے میں کیا سوچا ہوگا۔

اس نظم میں ندا فاضلی نے نہ تو اس ماں کے غصے کی عکاسی کی ہے اور نہ ہی نفرت کا اظہار بلکہ بہت ہی سادہ طریقے سے اس منظر کو قاری کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ ایک ماں عدالت میں کھڑی ہے اور جج صاحب اس سے اس کے بچوں کے قاتل کے بارے میں پوچھ رہے ہیں کہ کیا وہ ان لوگوں کو جانتی پہچانتی ہے جنھوں نے اس کے بچوں کو جلا کر مار ڈالا ہے۔ وہ سبھی کی طرف دیکھتی ہے اسے ہر آدمی اپنے جیسا ہی نظر آتا ہے کیونکہ اس کے دل میں ہمدردی، اور بھائی چارہ ہے اور انسان جیسا خود ہوتا ہے ویسی ہی رائے وہ دوسروں کے بارے میں بھی رکھتا ہے اسی لیے وہ کہتی ہے نہیں جج صاحب یہ لوگ وہ نہیں ہیں۔ وہ تو ایسے

لوگ تھے جنہیں انسان نہیں کہا جا سکتا اور وہ انسانوں کے رہنے کی جگہ سے بہت دور جہاں درندے رہتے ہیں یعنی جنگل سے آئے تھے جہاں کی رہنے والی عورتوں کی گودیں بچوں سے خالی ہیں۔ یعنی ان عورتوں کے دل میں بچوں کی محبت، پیار اور ممتا نہیں ہے اگر وہ بچے رکھتیں تو ان کے شوہر بھی ہوتے اور وہ اپنے بچوں کے باپ ہوتے۔ باپ کے دل میں بھی بچوں کے لیے محبت اور ہمدردی ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ دوسرے کے بچوں کے دکھ درد کو سمجھتے ہیں لیکن وہ لوگ تو ایسے تھے جنہیں ان احساسات کی فکر نہ تھی ایسا کام تو کوئی مہذب انسان نہیں درندہ صفت ہی کر سکتا ہے۔

اس نظم میں انھوں نے ماں کے ذریعے کہی گئی باتوں سے پورے سماج کو آئینہ دکھانے کا کام کیا ہے اور مشترکہ تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ہندوستانی تہذیب کی ایک پہچان آپسی بھائی چارہ بھی ہے اور وہ دوسرے کے غم کو اپنا غم سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہندوستانیوں میں رحم اور معاف کرنے کی صفت زیادہ ہوتی ہے اور وہ عام طور پر تشدد پسند بھی کم ہوتے ہیں۔ اس نظم میں ندؔا نے جس زبان کا استعمال کیا وہ تشدد پسند نہیں بلکہ بالکل سادہ اور سیدھی زبان کا استعمال کر کے اس نظم میں اس دردناک منظر کو ایک ستم رسیدہ ماں کی زبانی بیان کیا ہے۔ ہندوستانی عورت کو ہمیشہ سے ہی صبر و تحمل کی دیوی سمجھا گیا ہے۔ اس نظم کی ماں نے بھی صبر و تحمل کا درس دیا ہے۔

اب اسی طرح کے موضوع کو مخمور سعیدی کی نظم میں تلاش کرتے ہیں۔ اپنی نظم ''گولی چلا دو'' میں مخمور سعیدی نے اسے کس طرح برتا ہے ملاحظہ کیجیے:

دکانیں جل گئیں، بازار اُجڑے
اٹھا کر بے خطر مالِ غنیمت
فسادی جا چکے اپنے گھروں میں
محافظ شہر کے چوکس کھڑے ہیں
نکل آئے ہیں سڑکوں پر جو کچھ لوگ
کہ دیکھیں کیا لٹا ہے؟ کیا بچا ہے؟

انھیں ان کی جسارت کی سزا دو
یہی موقع ہے اب گولی چلا دو

(نظم ''گولی چلا دو'' سے)

اسی موضوع پر زبیر رضوی کی نظم ''بے نواؤں کے نام'' ملاحظہ ہو:

پھر وہی سب ہوا
نام کی تختیاں دیکھ کر
گھر جلائے گئے
لوگ مارے گئے
ننھے بچوں کو نیزوں پہ تولا گیا
بے ردا عورتوں کے
جواں لڑکیوں کے بدن
وحشی ہاتھوں سے نوچے گئے
پھر وہی سب ہوا
ایک انبوہ شہر ستم
قتل گاہوں کے نقشے بناتا رہا
بے نواؤں کی آبادیوں بستیوں کو جلاتا رہا
ظلم ایسا ہوا صبح سے شام تک
رات سے رات تک آگ اور خون میں
زندگی چیختی، بلبلاتی ہوئی بے صدا ہو گئی
بے اماں ہو گئی
حاکم وقت نے دست قاتل کو بوسہ دیا
رات سے رات تک اور تازہ لہو
خنجروں نے پیا، مقتلوں میں بہا

دست قاتل بتا اور کتنا لہو
تیری سفاک تیغوں کو درکار ہے
دیکھ تو، تیرے چاروں طرف
بے نواؤں کی لاشوں کا انبار ہے!

نظم ''گولی چلا دو'' میں شاعر کا لہجہ تلخ ہے اور سیدھے طور پر ستم رسیدہ لوگوں کی بے گناہی کا بیان ہے جن کے مکانات لوٹے گئے۔ جن کا مال واسباب لوٹا گیا اور جب فساد کی آنچ کم ہوئی تو گھر سے باہر سڑک پر آ کر یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ ان کا کیا کیا مال واسباب باقی رہا ہے اور کیا لٹ گیا ہے۔ اسی اثنا میں پولس نے انہی کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنا ڈالا، اخبارات میں اکثر و بیشتر ایسی خبریں شائع ہوتی ہیں کہ پولس اہلکار گنہگاروں کا ہی ساتھ دیتے ہیں اور بے گناہ ستم رسیدہ لوگوں کو قتل کر دیا جاتا ہے اور انھیں ہی مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے۔ زبیر رضوی کی نظم میں قتل وغارت گری اور وحشت وخوف کی فضا قائم ہے۔ اس میں بھی وہی منظر ہے جو مخمور سعیدی نے اپنی نظم میں پیش کیا ہے۔

موجودہ دور کے نشیب وفراز، قدروں کی پامالی اور تہذیب کے بکھراؤ سے سماج میں پھیلی ہوئی ناآسودگی اور رشتوں کی ناپائیداری کو زبیر رضوی نے اپنی نظم ''کرفیو'' مظہر امام نے ''اکھڑتے خیموں کا درد'' اور ندا فاضلی نے نظم ''پہچان'' میں اپنے اپنے انداز میں پیش کیا ہے۔ پہلے زبیر رضوی کی نظم ''کرفیو'' سے کچھ حصہ پیش کیا جا رہا ہے۔

یہ کون شب خون مارتا ہے
یہ کون خیمے جلا رہا ہے
یہ آسماں کس نے نوچ ڈالا
کوئی ستارہ کہیں نہیں ہے
یہ گریہ کرتی ہر ایک ساعت
ہر ایک منظر
کہیں بھی جائے اماں نہیں ہے

کہیں کوئی مہرباں نہیں
ہے
(نظم ''کرفیو'' سے)

اب آگے اسی موضوع کو مظہر امام نے کچھ اسطرح بیان کیا ہے:

کہیں بھی جائے اماں نہیں
ہے
نہ روشنی میں، نہ تیرگی میں
نہ زندگی میں، نہ خودکشی میں
عقیدے نیزوں کے زخم کھا کر سسک رہے ہیں
یقین کی سانس اکھڑ چلی
ہے

(''اکھڑتے خیموں کا درد'' سے)

ان دونوں میں انسانی بے چہرگی کے احساس کو صاف طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے لیکن اسی موضوع کو ندا فاضلی نے اپنی 10 مصرعوں کی نظم میں کس طرح پیش کیا ہے، ملاحظہ ہو:

زندگی انتظار جیسی
ہے
دور تک رہگذار جیسی
ہے
چند بے چہرہ آہٹوں کے سوا
ساری بستی مزار جیسی
ہے
راستے چل رہے ہیں صدیوں سے
کوئی منزل غبار جیسی
ہے
کوئی تنہائی اب نہیں تنہا
ہر خموشی پکار جیسی
ہے
زندگی روز کا حساب کتاب
قیمتی شے ادھار جیسی
ہے

یا ندا فاضلی کی ایک اور نظم کے چند اشعار پیش ہیں:

پہلے بھی جیتے تھے مگر جب سے ملی ہے زندگی

سیدھی نہیں ہے دور تک الجھی ہوئی ہے زندگی
اک آنکھ سے روتی ہے یہ اک آنکھ سے ہنستی ہے یہ
جیسی دکھائی دے جسے اس کی وہی ہے زندگی
جو پائے وہ کھوئے اسے جو کھوئے وہ روئے اسے
یوں تو سبھی کے پاس ہے! کس کی ہوئی ہے زندگی

اس نظم کے دوسرے شعر کے پہلے مصرعے ''اک آنکھ سے روتی ہے یہ اک آنکھ سے ہنستی ہے یہ'' کا خیال ندا فاضلی نے شاید ڈنمارک کے مشہور و معروف فلسفی شاعر اور مذہبی عالم سورین آبئے کیر کے گارد (Soren Aabyekierkegaqard) جو کہ صرف 42 سال کی عمر میں 1855 میں انتقال کر گئے تھے کی کتاب ''The Sickness Unto Death'' سے لیا ہے۔ سورین کیر کے گارد نے اپنی اس کتاب میں ایک جگہ اپنے بارے میں لکھا ہے کہ (I am Janus bifrons I laugh with one face and weep with the other)

(بہ حوالہ ''ملاقاتیں'' ندا فاضلی، ص:131-132، ص:6)

یعنی میں دو مکھی جینوس ہوں، میں ایک چہرے سے ہنستا ہوں اور دوسرے چہرے سے روتا ہوں۔ جینوس رومن میں دیو مالائی کہانیوں کا ایک مقدس کردار ہے جس کے دو چہرے ہیں اور یہ کردار وہاں بہت مشہور و مقدس سمجھا جاتا تھا اور آج بھی ہے۔ دونوں چہرے ایک دوسرے کے برعکس یعنی 180 کے زاویے پر تھے اور ان دونوں چہروں میں عمر کا بھی بہت فرق تھا۔ ایک چہرہ ضعیف شخص کا تھا تو دوسرا چہرہ نوجوان کا تھا، چہروں میں کوئی مماثلت نہیں تھی۔ اس کی یہ بھی خاصیت تھی کہ یہ دونوں چہرے بیک وقت الگ الگ جذبات کا اظہار کرتے تھے۔ اگر ایک چہرہ غم کا اظہار کرتا ہے تو دوسرا اسی لمحہ مسکراتا ہے۔ ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ انگریزی مہینے جنوری کا تعلق بھی اسی جینوس سے ہے۔ دراصل جنوری لفظ لاطینی زبان کے جینر یوس Janreus سے مشتق ہے۔ جینر یوس Janreus لفظ رومن کے مقدس دیوتا ''جینوس'' سے بنا ہے۔ اسی لیے جنوری مہینے کا نام

اسی دیوتا کے نام پر رکھا گیا کیونکہ جنوری مہینہ بھی گزرے ہوئے سال اور آنے والے سال دونوں کو دیکھتا ہے اسی لیے اس مہینے کا نام (جینوری) جنوری رکھا گیا۔

اسی مقدس دیوتا کی شکل دیکھنے والے جس احساس وجذبات سے شکل دیکھتے تھے انھیں اپنی زندگی ویسی ہی نظر آنے لگتی تھی۔ کیونکہ اس مقدس دیوتا کا تعلق ان کے مذہبی عقائد کے اعتبار سے عام لوگوں کی زندگی سے تھا، اگر کوئی غمزدہ چہرہ دیکھ رہا ہے تو اسے اپنی زندگی میں غم ہی نظر آتا تھا اور اگر کوئی اس دیوتا کے مسکراتے ہوئے چہرے کو دیکھتا تو اسے اپنی زندگی ہنستی ہوئی نظر آتی تھی۔ ندا فاضلی کی اس نظم کو سمجھنے کے لیے یہ سب جاننا بہت ضروری ہے جو مندرجہ بالا سطور میں بیان کیا گیا ہے۔ انھوں نے نظم کے اس شعر میں واقعی بہت ہی گہرائی وگیرائی سے کام لیا ہے جو ان کی وسعت مطالعہ کو ظاہر کرتی ہے۔

زبیر رضوی اور مظہر امام کی نظموں میں مایوسی اور افسردگی چھائی ہوئی ہے اور ایک طرح سے زندگی سے فرار کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ نہ تو روشنی میں نہ تیرگی میں نہ ہی زندگی میں اور نہ خودکشی میں۔ سوائے مایوسی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ لیکن ندا فاضلی کی دونوں نظموں پر مایوسی اور افسردگی کا کوئی پرتو نہیں۔ زندگی کے نشیب وفراز سے گزر کر کس طرح اس پر جیت حاصل کی جاسکتی ہے یا زندگی میں کس کس طرح کے دور آتے ہیں واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ زندگی کوئی کھیل نہیں جو آسانی سے ختم کرلی جائے۔ خدائے تعالیٰ نے انسان کو زمین پر حضرت آدمؑ کی شکل میں صرف جینے کے لیے نہیں اتارا تھا بلکہ مختلف مراحل سے گزر کر امتحان کی شکل میں زندگی گزارنے کے لیے اتارا تھا۔ جب وہ زمین پر تشریف لائے تھے تو زمین پر ان کے رہنے کے لیے کوئی بندوبست نہیں تھا، نہ کھانے پینے کے لیے کوئی معقول انتظام۔ حضرت آدمؑ کو زندگی جینی تھی انھوں نے ہر مشکل گھڑی میں شکر خدا کر کے زندگی کو جیا۔

زندگی کے مختلف روپ ہوتے ہیں۔ اس میں کبھی آسانی ہوتی ہے کبھی پریشانی ہوتی ہے تو کبھی پریشانی۔ لیکن انسان کو ہر وقت میں ثابت قدم رہنا چاہئے۔ زندگی کا جو الجھاؤ ہے وہ بڑی ہی محنتوں اور کاوشوں سے سلجھتا ہے۔ ہم جس زاویے سے زندگی کو

دیکھیں گے وہ ہمیں ویسی ہی نظر آئے گی چاہے منفی انداز میں دیکھیں یا مثبت انداز میں ۔ زندگی میں خوشی اور غم ساتھ ساتھ چلتے ہیں ۔ انہی سے انسان کے دل میں کسی کے لیے دردمندی پیدا ہوتی ہے ۔ اللہ نے انسان کو روئے زمین پر اشرف المخلوقات بنا کر بھیجا ہے مگر انسان اس بات سے غافل ہو کر زندگی سے ناراض ہو جاتا ہے اور زندگی سے راہ فرار اختیار کرنے لگتا ہے ۔

شہریار نے بھی اس موضوع کو اپنی نظموں میں برتا ہے۔ مثال کے لیے ان کے دو اشعار ملاحظہ ہوں:

جب بھی ملتی ہے مجھے اجنبی لگتی کیوں ہے
زندگی روز نئے رنگ بدلتی کیوں ہے

تجھ سے بچھڑے ہیں تو اب کس سے ملاتی ہے ہمیں
زندگی دیکھئے کیا رنگ دکھاتی ہے ہمیں

اسی موضوع کو شکیب جلالی کی نظموں میں دیکھئے۔ ان کے دو شعر اس طرف اشارہ کرتے ہیں:

ہمیں قبول نہیں زندگی اسیری کی
ہم آج طوق و سلاسل کو توڑ ڈالیں گے
فضا مہیب سہی، مرحلے کٹھن ہی سہی
سفینہ حلقۂ طوفاں سے ہم نکالیں گے

(نظم ''لہو ترنگ'' سے)

ان اشعار میں بغاوت اور انقلاب کو صاف طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے لہجہ میں تلخی ہونے کے ساتھ انھوں نے ان اشعار میں حقیقت کو مسخ نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے صاف طور پر یہ اعلان کر دیا کہ اب ہم اور ظلم و ستم نہیں سہیں گے اور جو بندشیں ہم پر لگائی گئی ہیں، ہم انھیں نہیں مانیں گے چاہے یہ راستہ کتنا بھی دشوار ہو۔ اس میں چاہے ہمیں کتنی ہی قربانیاں کیوں نہ دینی پڑیں۔ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم علم بغاوت بلند کریں اور اپنے حقوق حاصل کریں۔

ہندوستان ہمیشہ سے انسانی قدروں کا پاسدار رہا ہے۔ اگر ہمیں ان سبھی کی جھلک دیکھنی ہے تو اپنے قدیم ادب کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ ہمارا یعنی ہندوستان کا قدیم ادب انسانی احساسات وجذبات کا اصل ترجمان ہے۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمیں ادب کا مطالعہ صحیح طور پر اور صحیح سمت میں کرنا ہوگا۔ ہندوستان ہی وہ ملک ہے جہاں ہر کسی کو آزادانہ طور پر رہنے کی آزادی ہے چاہے وہ کسی بھی مسلک، کسی بھی مذہب کا ہو۔ وہ اپنی مذہبی و مسلکی تقریبات آزادی کے ساتھ کرسکتا ہے۔ ہندوستان کی مٹی میں ایک عجیب طرح کی خوشبو اور کشش ہے جو بھی یہاں آیا وہ یہیں کا ہو کر رہ گیا لیکن کچھ لوگوں نے ہندوستان کی اس تہذیب کو مجروح کرنا چاہا اور تمام ہندوستان میں جگہ جگہ فسادات کرائے گئے۔

ندا فاضلی کی نظم ''ایک قومی رہنما کے نام'' اسی فرقہ واریت کے خلاف ایک احتجاج ہے۔ فنکار احتجاج کو اپنے طریقے سے عمل میں لاتا ہے۔ وہ بے چینی اور بے صبری سے اپنی احتجاجی آواز کو کرب اور تڑپ کے ساتھ بلند کرتا ہے۔ لیکن اس آواز کے بلند کرنے کا آلہ صرف اس کی زبان نہیں ہوتی بلکہ وہ اسے صفحۂ قرطاس پر لکھ کر بھی بلند کرتا ہے وہ پریشان کن حالات اس کے ذہن میں گردش کرنے لگتے ہیں۔ ہر اچھا شاعر حالات کی ستم ظریفی پر بے اطمینانی اور کرب کا اظہار کرتا ہے۔ ندا فاضلی نے بھی اسی بے اطمینانی کا اظہار اس نظم میں کیا ہے:

مجھے معلوم ہے
تمہارے نام سے منسوب ہیں
ٹوٹے ہوئے سورج
شکستہ چاند
کالا آسماں
کرفیو زدہ راہیں
سلگتے کھیل کے میدان
روتی چیختی مائیں

مجھے معلوم ہے
چاروں طرف
جو یہ تباہی ہے
حکومت میں
سیاست کے تماشے کی گواہی
تمہیں!
ہندو کی چاہت ہے
نہ مسلم سے عداوت ہے
تمہارا دھرم!
صدیوں سے تجارت تھا
تجارت ہے
مجھے معلوم ہے لیکن
تمہیں!
مجرم کہوں کیسے
عدالت میں
تمہارے جرم کو ثابت کروں کیسے
تمہاری جیب میں خنجر
نہ ہاتھوں میں
کوئی بم تھا
تمہارے رتھ پہ تو
مریادا پرشوتم کا پرچم تھا

ندا فاضلی کی اس نظم میں احتجاجی لہجہ تو سامنے آتا ہے لیکن اس میں تشدد نام کے لیے بھی نہیں ہے۔ بالکل سیدھی باتیں ہیں جن کو سیدھے اور آسان الفاظ کے ساتھ بیان کردیا گیا

ہے۔اسی احتجاج کو بہت سے شعراء نے اپنی نظموں میں مختلف اسالیب کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مثلاً: معین احسن جذبیؔ، جاں نثار اختر، اختر الایمان وغیرہ۔ ندا نے مذکورہ بالا نظم میں اپنے احتجاج کو اپنے طریقے سے اپنایا ہے اور اس درد و احساس کو پیش کیا ہے جو انھوں نے محسوس کیا، اس نظم میں انہوں نے متوازن لہجہ اختیار کر کے فرقہ واریت کے خلاف احتجاج درج کیا ہے۔ پوری نظم میں کہیں تشدد کا احساس تک نہیں ہونے دیا۔

جذبیؔ کی نظم ''نقاد'' اور ''نیا سورج'' میں بھی فسادات کو موضوع بنایا گیا ہے۔اسی موضوع کو محمد علوی نے اپنی ایک نظم جس کا عنوان ''اڈوانی جی کے نام'' ہے میں اس طرح پیش کیا ہے:

چلو یہ سچ ہے کہ یہ رام جنم بھومی ہے
مگر یہ پاک زمیں ہم نے بھی تو چومی ہے
چراغ ہم نے یہاں پر جلائے ہیں برسوں
ہمارے سجدے یہاں جگمگائے ہیں برسوں
نماز پڑھنا برا کام ہو نہیں سکتا
خفا ہیں آپ خفا رام ہو نہیں سکتا

اس مختصر سی نظم میں انھوں نے لال کرشن اڈوانی سے مخاطب ہو کر کہا ہے کہ اگر آپ اس کو رام جنم بھومی مانتے ہیں تو یہ بات بھی ماننی چاہئے کہ یہاں پر ہم نے برسوں نمازیں پڑھی ہیں۔اسی زمین پر سجدے بھی کئے ہیں۔اگر آپ کو یہ برا لگتا ہے تو یہ آپ کی غلطی ہے کیونکہ نماز پڑھنا کوئی برا کام نہیں ہے آپ چاہے اس سے کتنے بھی ناراض ہوں لیکن رام کبھی ناراض نہیں ہوں گے۔نظم میں انھوں نے اپنے عقیدے کی بھی عکاسی کی ہے۔

محمد علوی کی نظم کا مطالعہ کرنے پر یہ بات صاف طور پر عیاں ہوتی ہے کہ اس میں احتجاج تو ہے لیکن وہ شدت اختیار کر گیا ہے۔ندا کے یہاں احتجاجی آہنگ میں نظم ایک توازن کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔

ندا فاضلی کی نظموں میں جو ایک طرح کی بے چینی، درد اور گھبراہٹ ہے وہ اسی ماحول کی پیدا کردہ ہے جس میں ندا رہے اور انہوں نے دیکھا اور پرکھا۔یہ درد، گھبراہٹ اور بے چینی

ان کے اپنے دور کی سماجی ومعاشرتی اور سیاسی تبدیلیوں سے پیدا ہوئی ہے۔ سماج سے ایک اچھے شاعر کا تعلق گہرا ہوتا ہے۔ سماج میں اگر ذرا بھی اتھل پتھل ہوتی ہے تو شاعر بے چین ہو اٹھتا ہے۔ یہی وجہ ہے جو انہوں نے اپنی نظموں میں عہد حاضر کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

ندا فاضلی کی شاعری میں تصنع کو قطعی دخل نہیں ہے۔ اس کی وجہ صاف ہے کہ انھوں نے سماجی ومعاشرتی دکھ درد کو اپنی ذات میں خود تلاش کیا ہے کیونکہ وہ اس دکھ درد سے دوچار ہوئے تھے اسی لئے ان کی نظمیں بناوٹ اور الفاظ کی کاری گری سے بالکل آزاد ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں میں جذبات واحساسات کو جگہ دی ہے اور کہیں بھی ایسا محسوس نہیں ہونے دیا جس سے ایسا لگے کہ انھوں نے یہ نظم یا کوئی شعر زبردستی کہا ہے نہ انھوں نے الفاظ میں سحر کاری پیدا کرنے کی کوشش کی اور نہ ہی اسے بیل بوٹوں سے سجانے کی کوشش کی۔

فیض احمد فیض کا خیال ہے کہ:

> ''شعر استحصالی صورت میں ہتھیار کی صورت ہوتے ہیں اور اگر شاعری اپنے گرد و پیش کے ماحول کو دیکھتے ہوئے جوڑوں اور رستے ہوئے ناسوروں سے پہلو تہی کرتے ہوئے آنکھوں پر پٹی باندھ لیتی ہے تو پھر شاعری Objective Realism سے کوسوں دور ہوتی ہے۔ لیکن جب شاعر ان دکھتے ہوئے جوڑوں اور رستے ہوئے احساسات کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ جن کو یہ دیکھتے ہوئے جوڑ اور رستے ہوئے ناسور جنم دیتے ہیں تو پھر شاعری کامیاب ہتھیار بن جاتی ہے۔'' [۳]

فیض کا یہ اقتباس ندا کی نظموں کی ترجمانی کرتا ہے۔ ان کی نظمیں ماحول کے درد وکرب اور انسانی اقدار کے پامال ہوتے ہوئے احساس سے رستے ہوئے ناسور کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ انھوں نے اپنے عہد کے مسائل کی ترجمانی اس خوش اسلوبی سے کی ہے کہ ان کے عہد کا غم اپنا ذاتی غم بن کر سامنے آیا ہے۔

آج ایسے بھی لوگ ہیں جو انسانیت کو مجروح کرنے پر آمادہ ہیں انسانیت کا

راگ الاپنے والے انسانیت کو مجروح کرنے یا اسے نقصان پہنچانے میں کسی قسم کی کوئی کسر باقی رکھنا نہیں چاہتے۔ یہی ہمارے عہد کا سب سے بڑا المیہ ہے کہ لوگ چہروں پہ چہرہ چڑھائے ہوئے ہیں اور شیطانی چہرے کو چھپائے ہوئے انسانیت کے ہمدرد بنے بیٹھے ہیں۔ ندا نے انہی صفات کو اپنی نظموں میں درد و غم کی کیفیت اور طنز کی آمیزش کے ساتھ پیش کیا ہے جن سے ان کی نظم نگاری قنوطیت کے دائرے میں نہیں آتی۔ انسانیت کے ٹھیکیداروں نے انسانوں پر ہی حیات تنگ کر دی ہے اور وہ اس کی آڑ میں چھپ کر اپنے ذاتی، مذہبی اور مسلکی مفاد کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ مرض صرف ہندوستان میں ہی ہو بلکہ وہ اسے تمام دنیا میں پاتے ہیں اور پڑوسی ملک یعنی پاکستان میں بھی اس مرض کے اثرات دیکھتے ہیں۔ یہ نظم دونوں جگہوں کی اس مہلک بیماری کی عکاسی کرتی ہے جس کا عنوان ''انسان'' ہے۔

انسان میں حیوان یہاں بھی ہے وہاں بھی
اللہ نگہبان یہاں بھی ہے وہاں بھی
خوں خوار درندوں کے فقط نام الگ ہیں
ہر شہر بیابان یہاں بھی ہے وہاں بھی

اصل میں حیوان انسان کے اندر ہی چھپا ہوا ہوتا ہے ضرورت صرف موقع کی ہوتی ہے۔ وہ موقع پا کر ہی اپنی اصل شکل اختیار کر لیتا ہے اور انسانیت کو نوچ ڈالتا ہے۔ ان دونوں اشعار میں ندا نے پاکستان اور ہندوستان کا ذکر کیا ہے۔ جب دونوں جگہ پر یہ فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے تھے اور اس کا خمیازہ صرف اور صرف انسانوں کو بھگتنا پڑ رہا تھا۔ ہندوستان میں بھی اسی لوٹ مار کے سبب شہر ویران تھے اور پاکستان میں بھی۔ اگر نام بدلا تو صرف ملک یعنی جگہ کا۔ درندے دونوں جگہ موجود تھے اور اپنا کام سفاکی کے ساتھ انجام دے رہے تھے اور شہر در شہر ویران ہو رہے تھے۔

ہندو بھی سکوں سے ہے مسلماں بھی سکوں سے
انسان پریشان یہاں بھی ہے وہاں بھی

ندؔا فاضلی کا یہ شعر کتنی وسعت سمیٹے ہوئے ہے۔ پاکستان میں مسلمان ہندوؤں پر ظلم کر رہے تھے اور ہندوستان میں ہندو مسلمانوں پر ظلم کر رہے تھے۔ وہاں مسلمان سکون سے تھا تو یہاں ہندو سکون سے۔ دراصل یہ ایک طرح کا طنز ہے حقیقت میں نہ تو مسلمان پاکستان میں اور نہ ہی ہندو ہندوستان میں سکون سے تھے انسانیت ہی دونوں ملکوں میں ظلم وستم کا شکار تھی۔ اس انسانیت کے درد کا مداوا کہیں نہیں ہوا۔ نقصان کس کا ہوا؟ اس کا جواب ندؔا کے اس شعر میں مل جاتا ہے کہ اگر کسی کو نقصان ہوا تو وہ صرف انسان تھا جو دونوں ملکوں میں پریشاں رہا۔

اٹھتا ہے دل وجاں سے دھواں دونوں طرف ہی
یہ میرؔ کا دیوان یہاں بھی ہے وہاں بھی

اس آخری شعر میں ندا نے لفظ ''دل'' کا استعمال کر کے انسانیت کی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ دل تو سبھی کے پاس ہوتا ہے چاہے وہ انسان ہو یا درندہ مگر دل کا جلنا اور پھر اس سے دھواں اٹھنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس دل کو ٹھیس لگی ہے۔ دونوں ملکوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو حساس دل رکھتے تھے اور انھوں نے اس سانحے پر دکھ کا اظہار بھی کیا ہے۔ اس سانحے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے غم و آفات کو انھوں نے میر کے دیوان سے تشبیہ دے کر نئے معنی سے روشناس کرایا ہے۔ کیونکہ میرؔ کے دیوان کو اپنے عہد کا مرثیہ اور نوحہ کہا جاتا ہے۔ نظم ''ایک لٹی ہوئی بستی کی کہانی'' میں بھی انھوں نے اس درد کو پیش کیا ہے۔

فسادات پر مبنی ندؔا کی ایک اور نظم ''جنگ'' ہے۔ جس میں انھوں نے جنگ کے حالات بیان کیے ہیں اور یہ بتایا ہے کہ جب جنگ کا خاتمہ ہوتا ہے تو ممالک یہ اطمینان کر لیتے ہیں کہ اب جنگ ختم ہو گئی۔ لیکن اصل جنگ اس جنگ کے ختم ہونے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ نظم ملاحظہ ہو:

سرحدوں پر فتح کا اعلان ہو جانے کے بعد
جنگ!
بے گھر بے سہارا
سرد خاموشی کی آندھی میں بکھر کے

ذرہ ذرہ
پھیلتی ہے
تیل
گھی
آٹا
کھنکتی چوڑیوں کا روپ بھر کے
بستی بستی ڈولتی ہے
دن دہاڑے
ہر گلی کوچے میں گھس کر
بند دروازوں کے سانکل کھولتی ہے
مدتوں تک
جنگ گھر گھر بولتی ہے
سرحدوں پر فتح کا اعلان ہو جانے کے بعد

اس نظم میں ندا نے جنگ کے بعد پیدا ہونے والے مسائل اور درد و کرب کو پیش کیا ہے۔ جب جنگ کے نتیجے میں انسانوں کے گھر تباہ و برباد ہو جاتے ہیں اور انھیں دوبارہ تعمیر کرنے کا جو مسئلہ پیدا ہوتا ہے یا پھر جنگ میں کسی کی شہادت کے بعد اس کے گھر میں روزی روٹی کا جو مسئلہ پیدا ہوتا ہے وہ اپنے آپ میں جنگ سے کم نہیں۔ نظم میں 'تیل'، 'گھی' اور 'آٹا' سے اس طرف اشارہ ہے کہ روزی روٹی کا مسئلہ درپیش آتا ہے۔ ایک بیوہ جس کا شوہر اس جنگ میں مارا گیا اس سے پوچھئے کہ جنگ ختم ہوئی ہے یا اب شروع ہوئی ہے۔ ان بچوں سے پوچھئے جو اسی جنگ میں یتیم ہو گئے، جنگ ختم ہوئی ہے یا شروع ہوئی ہے۔ ان بوڑھے ماں باپ سے پوچھئے جن کا جوان بیٹا ان کی زندگی کا اثاثہ تھا۔ اور وہ اس جنگ میں مارا گیا ان کے لیے جنگ ختم ہوئی ہے یا شروع ہوئی ہے؟ ایسے میں یقیناً ہمیں جواب ملے گا کہ جنگ اب شروع ہوئی ہے۔ اگر جنگ سے پہلے اس کے

نتیجوں پر غور کرلیا جائے تو کبھی جنگ نہیں ہوگی۔ اور جب جنگ نہیں ہوگی تو اتنا خطرناک چہرہ بھی ہمارے سامنے نہیں آئے گا۔ فسادات سے متعلق نظمیں اور بھی ہیں جن کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ ''ستمبر 1965''، ''پاسپورٹ آفیسر کے نام'' اور بہت سی نظمیں بلاعنوان کے ہیں جن میں فساد کا یہ درد ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اس طرح کی نظمیں واقعاتی شاعری کی بہترین مثال ہیں۔

ندؔا کی فسادات سے متعلق نظموں میں تاریخ اور سیاست کا جبر آرٹ کی جمالیات کو مجروح نہیں کرتا یہی ندا کے شاعرانہ اظہار کی قوت ہے۔ یہ درست بھی ہے کہ اگر کسی موضوع کو محض واقعات کی سطح پر جذباتی رو میں لکھا جائے گا تو وہ ادب کے زمرے میں نہیں آئے گا۔ اس موضوع کو اگر جمالیاتی سطح پر برتا جائے تو وہ ادب پارہ بن جاتا ہے۔ ندا فاضلی نے اکثر ایسے ہی موضوعات کو اپنی شاعری کے لیے منتخب کیا ہے۔ وہ اپنے وسیع مطالعے اور اپنے شعور کو داخلی احساسات کے ساتھ کچھ اس طرح ہم آہنگ کرتے ہیں کہ ان کے اس اسلوب کی مثال اگر دینی ہو تو پابلو نرودا اور جرمن شاعر ایرش فریڈ کی نظموں سے دی جاسکتی ہے جو شعری خصوصیات ان دونوں کے یہاں پائی جاتی ہیں وہی ندا کے یہاں بھی موجود ہیں۔ لیکن جیسے جیسے ندا کی شاعری کا دور آگے بڑھتا گیا ان کی شاعری پر صوفی سنتوں کی انسانی دوستی کا اثر زیادہ دکھائی دینے لگا جس کا اعتراف انھوں نے خود بھی کیا ہے۔ پاکستان کے شعراء افضال احمد سید، ثروت حسین، ذیشان ساحل کی نظموں میں بھی یہ اثر واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے، انھوں نے اپنی داخلی اور قطعی قسم کے ذاتی جذبات واحساسات کو وسیع منظرنامے میں بدل کر اسے ذات کا نوحہ نہیں بننے دیا، بلکہ ایک آفاقی تناظر بنا کر پیش کیا۔ ندؔا فاضلی کی نظم ''ایک لٹی ہوئی بستی کی کہانی'' ملاحظہ کیجیے:

بجی گھنٹیاں/ اونچے مینار گونجے
سنہری صداؤں نے/ اجلی ہواؤں کی پیشانیوں پر
رحمت کے/ برکت کے/ پیغام لکھے

وضو کرتی صبح
کھلی کہنیوں تک منور ہوئیں
جھلملائے اندھیرے/ بھجن گاتے آنچل نے
پوجا کی تھالی سے بانٹے سویرے
کھلے دوار/ بچوں نے بستہ اُٹھایا
بزرگوں نے پیڑوں کو پانی پلایا
نئے حادثوں کی خبر لے کے
بستی کی گلیوں میں اخبار آیا
خدا کی حفاظت کی خاطر/ پولس نے
پجاری کے مندر میں/ ملاّ کی مسجد میں/ پہرا لگایا
خدا! ان مکانوں میں لیکن کہاں تھا
سلگتے محلوں کے دیوار و در میں/ وہی جل رہا تھا
جہاں تک دھواں تھا۔

جب پاکستان اور ہندوستان کا بٹوارا ہوگیا اور پاکستان بن گیا تو پاکستان میں محمد علی جناح نے پہلی تقریر میں کہا تھا کہ اب یہاں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی جو بھی ہیں وہ پاکستانی ہیں اور انہیں آزادی ہے کہ وہ یہاں رہیں۔ لیکن ندؔا فاضلی کو یہ شکوہ تھا کہ اگر یہی بات 1947 یعنی تقسیم ہند سے پہلے کہی جاتی تو یہ لاکھوں لوگوں کی جانیں بچ جاتیں اور وہ عصمتیں بھی لٹنے سے بچ جاتیں جو تقسیم ہند کے نتیجے میں تار تار ہوئیں۔

ندؔا فاضلی اپنے پورے خاندان کے پاکستان ہجرت کر جانے کے باوجود بھی پاکستان نہیں گئے کیونکہ وہ سوچتے تھے کہ زمین کی تبدیلی مسائل کا حل نہیں ہے اور اس زمانے کے مسائل کسی ذات پات یا مذہب میں بٹے ہوئے نہیں تھے بلکہ وہ انسانی مسائل تھے۔ انہی مسائل کے حل کے لئے وہ زمین کی تبدیلی کے لیے راضی نہ ہوئے اور اسی زمین پر انہوں نے مسائل کا حل تلاش کیا۔ نظم ''انسان'' ملاحظہ کیجیے۔

انسان میں حیوان یہاں بھی ہے وہاں بھی
اللہ نگہبان یہاں بھی ہے وہاں بھی

خوں خوار درندوں کے فقط نام الگ ہیں
ہر شہر بیابان یہاں بھی ہے وہاں بھی

ہندو بھی سکوں سے ہے مسلماں بھی سکوں سے
انسان پریشان یہاں بھی ہے وہاں بھی

رحمٰن کی رحمت ہو کہ بھگوان کی مورت
ہر کھیل کا میدان یہاں بھی ہے وہاں بھی

اُٹھتا ہے دل و جاں سے دھواں دونوں طرف ہی
یہ میرؔ کا دیوان یہاں بھی ہے وہاں بھی

☆☆☆

ایک ہی دھرتی ہم سب کا گھر جتنا تیرا اُتنا میرا
دکھ سکھ کا یہ جنتر منتر جتنا تیرا اُتنا میرا
(ندافاضلی)

قومی یکجہتی

ندافاضلی کواردواور ہندی دونوں زبانوں میں اہمیت حاصل ہے۔انہوں نے اردواور ہندی کے سادہ اورآسان الفاظ کوایک ہی مالا میں پروکرنظم میں ایک دلکشی اور جاذبیت پیدا کردی ہے جوقاری کواپنی طرف کھینچتی ہے۔اوراس دلکشی اور جاذبیت کے تارقاری کے دل کے تاروں سے مل جاتے ہیں۔ان کی نظموں میں پیچیدہ الفاظ کم سے کم ہیں۔ان کی نظموں میں محاورے اور مرکب الفاظ کم ہی ملتے ہیں،ان کی نظم ''موت کی نہر'' اردواور ہندی کے سادہ سلیس الفاظ کے استعمال کی مثال ہے۔

پیار،نفرت،دَیا، جفا،احسان
قوم، بھاشا،وطن، دھرم،ایمان
عمرگویا
چٹان ہے کوئی
جس پہ انسان کوہ کن کی طرح
موت کی نہر
کھودنے کے لیے
سیکڑوں تیشے
آزماتا ہے

ہاتھ پاؤں چلائے جاتا ہے

اس نظم میں ہندی کے الفاظ دِیا، بھاشا، دھرم نے اسے الگ رنگ دے دیا ہے۔اس نظم کا پیغام بھی انسانی زندگی کی کشمکش ہے۔انھوں نے اس زندگی کو ایک پہاڑ اور چٹان سے مشابہ قرار دیا ہے۔جس طرح فرہاد نے شیریں کی محبت میں اسے پانے کے لیے پہاڑوں کے بیچ سے دودھ کی نہر نکالی تھی اس میں اسے کتنی پریشانیوں کا سامنا ہوا تھا مگر آخر کار اس نے کڑی محنت سے وہ کام انجام دے ہی دیا۔اسی طرح انسان بھی اگر ہمت نہ ہار کر زندگی کی پریشانیوں سے لڑتا رہے تو وہ بھی ایک دن اس پر فتح حاصل کرلے گا۔اس نظم میں انھوں نے صنعت تلمیح کا استعمال کیا ہے۔یہ نظم سیدھے قاری کے دل پر اثر کرتی ہے۔

ان کی نظموں میں مشترکہ تہذیب کا اثر واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔اکثر نظموں میں مذہبی رواداری کا علم اونچا نظر آتا ہے۔اسی وجہ سے ایم نصراللہ نصرؔ نے انھیں مذہبی اور معاشرتی رواداری کا علمبردار کہا ہے۔ندا فاضلی نے معیاری نظمیں کہی ہیں جب ہم ان نظموں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اپنے چاروں طرف طرح طرح کے پھول کھلتے نظر آتے ہیں اور ساری فضا مہک جاتی ہے۔مشترکہ تہذیب کے احساس سے بھرپور نظم قاری کے دل میں اتر جاتی ہے اور مطالعہ کرتے وقت نئے نئے تجربات سامنے آتے ہیں۔ندا کی نظم ''مردہ گھر میں بٹوارا'' قومی یکجہتی اور بھائی چارے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

ساری لاشیں
ایک سی تھیں
وہ ہی آنکھیں۔میری جیسی
وہ ہی ٹانگیں۔تیری جیسی
سارے بچے۔بچوں جیسے
سارے بوڑھے۔بوڑھوں جیسے

اب اس نظم کا آخری حصہ ملاحظہ کیجیے:

زندگی کو جس طرح ٹکڑوں میں بانٹا جارہا تھا

موت کو بھی..........

ذات اور دھرموں سے

چھانٹا جارہا تھا

کون کس کا؟

کس کے کتنے؟

غم تو غم ہے

زعفرانی کیا، ہرا کیا؟

میرے ماتم میں

وہاں جتنے بھی تھے

انسان تھے وہ

ٹوٹا پھوٹا

میرا ہندوستان تھے وہ

اس نظم میں ایک حساس دل کا درد ابھر کر سامنے آیا ہے۔ انھوں نے اس غم کو ہندو مسلمان میں بٹنے نہیں دیا بلکہ اسے غم ہی مانا ہے اور یہی حقیقت بھی ہے کہ درد تو بس درد ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ اگر وہ کسی دوسرے مذہب سے ہے تو اس کا درد الگ ہوگا۔ یہی درد کا احساس ایک انسان ہونے کی دلیل بھی ہے۔ ندا کا درد عالمی درد ہے، وہ کسی ذات پات میں قید نہیں ہے۔ ندا کی قومی یکجہتی اور مشترکہ تہذیب کی مثال نظم ''کھیل'' میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس مختصری نظم میں انھوں نے ہندو مسلم کی شناخت کرکے اسے ایک انسانی پیکر عطا کیا ہے۔ نظم ملاحظہ کیجیے:

آؤ

کہیں سے تھوڑی سی مٹی بھر لائیں

مٹی کو بادل میں گوندھیں
نئے نئے آکار بنائیں
کسی کے سر پر چٹیا رکھ دیں
ماتھے اوپر تلک سجائیں
کسی کے چھوٹے سے چہرے پر
موٹی سی داڑھی پھیلائیں
کچھ دن ان سے جی بہلائیں

نظم کے اس حصے میں انھوں نے ہندو مسلم کی شناخت کا ذکر کیا ہے۔ جس طرح بچے اپنے کھیل میں مٹی کے کھلونے بناتے ہیں اور وہ انھیں کسی بھی شکل میں ڈھال دیتے ہیں نہ تو ان میں ہندو ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی مسلمان۔ وہ تو اسے صرف ایک انسان کی شکل ہوتی ہے۔ اس نظم میں ندا فاضلی نے مورتیوں کا ذکر کیا ہے کہ ہم مٹی سے مورتیوں کو بنا کر کسی کو ہندو کی شکل دے کر ایک الگ پہچان دیں اور کسی کو مسلمان کی شکل دے کر ایک پہچان دیں۔ اور جب تک جی نہ بھر جائے انھیں اسی پہچان کے ساتھ رہنے دیں اور کھیلتے رہیں۔ نظم کا دوسرا حصہ دیکھیے:

اور یہ جب میلے ہو جائیں
داڑھی چوٹی تلک سبھی کو
توڑ پھوڑ کے گڈ مڈ کر دیں
ملی جلی یہ مٹی پھر سے
الگ الگ سانچوں میں بھر دیں
نئے نئے آکار بنائیں
داڑھی میں چوٹی لہرائیں
کس میں کتنا کون چھپا ہے
کون بتائے

نظم کے اس حصے میں ندا نے بتایا ہے کہ جب بچہ ایک ہی طرح کے کھلونے سے کھیل کر اُوب جاتا ہے تو وہ انھیں توڑنے پھوڑنے لگتا ہے۔ اسی طرح ہم بھی جب ان سے اوب جائیں تو انھیں توڑ کر پھر سے پانی ملا کر مٹی گوندھیں اور نئے کھلونے بنائیں۔ اب کون بتا سکتا ہے کہ ہندو والی کی مٹی کون سی ہے اور مسلمان والی کون سی۔ بلکہ اب وہ مٹی ایک دوسرے میں گھل مل گئی ہے۔ نہ تو کسی داڑھی کا پتہ چلتا ہے اور نہ ہی کسی کے تلک کا۔ اسی طرح اللہ نے ہم کو انسان کی شکل میں پیدا کیا ہے مگر ہم نے اپنے اپنے مذہب اور مسلک کی بنا پر اسے ایک ظاہری شناخت دے دی ہے جس کی وجہ سے ہم اسے ہندو یا مسلمان کہتے ہیں۔ پیدا ہوتے وقت انسان کی کوئی شناخت نہیں ہوتی اور مرنے کے بعد بھی کوئی شناخت نہیں۔ مسلمان کو بھی مٹی میں ہی مل جانا ہے اور ہندو کو بھی خاک ہو جانا ہے۔ اس شناخت کا ذمہ دار خود انسان ہی ہے۔ یہ نظم قومی یکجہتی کی اچھی مثال ہے۔ بالکل سادہ الفاظ استعمال کر کے اس کی فضا کو اثر آفریں بنا دیا ہے۔

ندا نے اسی نظم کو اپنے کلیات ''شہر میں گاؤں'' میں صفحہ 310 پر ''کھلونے'' کے عنوان سے کچھ تبدیلی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اور اس نظم کے مصرعوں کی ہیئت بھی کئی جگہ تبدیل ہے۔ مثلاً عنوان ''کھیل'' کے تحت جو نظم ہے اس میں مصرعہ اس طرح ہے:

اور یہ جب میلے ہو جائیں
داڑھی چوٹی تلک سبھی کو

اور عنوان ''کھلونے'' میں بھی مصرعے کچھ اس طرح ہیں:

اور جب یہ میلے ہو جائیں
داڑھی
چوٹی
تلک سبھی کو

''کھلونے'' عنوان سے نظم میں جو مصرعوں کا ربط و تسلسل ہے وہ اس نظم کو ایک پرکشش فضا عطا کرتا ہے۔ داڑھی، چوٹی اور تلک کو زور سے وقفے پر ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے سے نظم

کی فضا پُر اثر ہو جاتی ہے۔

اسی اردو ہندی الفاظ کے امتزاج کی مثال محمد علوی کی نظموں میں بھی ملتی ہے۔ ان کی نظم ''ایک منظر'' ملاحظہ کیجیے:

پربت کی چوٹی پر
سوریہ براج مان ہے
یوں لگ رہا ہے
جیسے کوئی نیتا
اونچے منچ پر بیٹھا
بھاشن دے رہا ہے
گھاٹی میں
ہزاروں لاکھوں پیڑ
ہرے ہرے پگڑ باندھے
کاندھے سے کاندھا ملائے
بھاشن سن رہے ہیں
بات بات پر
سر دھن رہے ہیں!!

ہندوستانی تہذیب کو ان درویشوں اور قلندروں نے پیش کیا جو یہاں آئے اور آ کر عوام سے، یہاں کے غریبوں اور بیماروں سے اور یہاں کے عام لوگوں سے محبت کی اور انھیں اپنا گرویدہ بنالیا۔ ان کے مزاروں پر اب بھی ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سبھی اپنی مرادیں مانگنے آتے ہیں۔

اسی سلسلے کی ندا کی ایک اور نظم ''اتفاق'' ہے جس میں انھوں نے انسانیت کے مختلف ناموں کا ذکر کیا ہے۔ جس میں مذہب، ملک اور زبان کا ذکر کیا ہے یہ سبھی انسانیت کو نقصان پہنچانے میں برابر کے ذمے دار ہیں۔

ندا کی ایک نظم جس کا عنوان ہی ''قومی یکجہتی'' ہے اس میں انھوں نے اس کے معنی کو ایک وسیع پیمانے پر دکھانے کی کوشش کی ہے۔ نظم پیش کی جاتی ہے:

وہ طوائف
کئی مردوں کو پہچانتی ہے
شاید اسی لیے
دنیا کو جانتی ہے
اس کے کمرے میں
ہر مذہب کے بھگوان کی ایک ایک تصویر لٹکی ہے
یہ تصویریں
لیڈروں کی تقریروں کی طرح نمائشی نہیں
اس کا دروازہ
رات گئے تک

ہندو
مسلم
سکھ
عیسائی
ہر مذہب کے آدمی کے لیے کھلا رہتا ہے
خدا جانے
اس کے کمرے کی سی کشادگی
مسجد اور مندر کے آنگنوں میں کب پیدا ہوگی

اس نظم میں انھوں نے ایک طوائف اور اس کے کوٹھے کی منظر کشی کر کے اس طوائف کے کوٹھے کو مندر اور مسجد سے بہتر بتانے کی کوشش کی ہے۔ اور مختلف فرقوں سے وابستہ لوگوں پر کاری ضرب لگانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں وہ اس طوائف کا ذکر کرتے ہیں جس کے

کوٹھے پر ہر طرح کا انسان ہندو و مسلم، سکھ اور عیسائی کوئی بھی ہو بلا تکلف آتا ہے اور بغیر کسی روک ٹوک کے اپنے پیسوں کی قیمت وصول کر چلا جاتا ہے اور اس میں طوائف ان سبھی لوگوں کا خیر مقدم بھی کرتی ہے نہ تو وہ ان میں سے کسی سے بھی ان کا نام پوچھتی ہے اور نہ مذہب، نہ ملک پوچھتی ہے اور نہ زبان۔ کیونکہ اسے ان تمام چیزوں (باتوں) سے کوئی مطلب نہیں۔ وہ تو صرف اپنے کام سے مطلب رکھتی ہے اسے اپنا پیٹ بھی پالنا ہے۔ ندا طوائف کے اس وصف کو دکھاوا نہیں مانتے۔ جس طرح سیاسی لیڈر اپنی تقریروں میں انتخابی مہم کے وقت اپنے مفاد کے لیے جھوٹے وعدے کرتے ہیں اور اپنا فائدہ ہو جانے پر انھیں وہ وعدے یاد نہیں رہتے اس کے برعکس اس طوائف کے یہاں لگی ہوئی ہر مذہب کے بھگوان کی تصویر اور اس کا یہ عمل دکھاوا نہیں بلکہ اس کی وسیع القلبی ہے۔ کیونکہ وہ ان تصویروں میں بیٹھے بھگوان کے ماننے والوں کو نہ صرف اپنے یہاں بلاتی ہے بلکہ ان کا خیر مقدم بھی کرتی ہے۔ دیر رات تک اس طوائف کا دروازہ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب کے لیے کھلا رہتا ہے۔ ندا نے اس طوائف کے کمرے کو بہت ہی کشادہ مانا ہے۔ شاید ان کا کہنے کا مطلب یہ رہا ہو کہ مسجد ہو یا مندر ان میں صرف اسی کے ماننے والے جاتے ہیں اگر ہندو ہے تو وہ صرف مندر میں جا سکتے ہیں اور مسجد ہے تو اس میں صرف مسلمان ہی جا سکتے ہیں۔ اس نظم کے اعتبار سے مسجد یا مندر میں وہ وسعت نہیں جو اس طوائف کے کمرے میں ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ندا کو مندر اور مسجد کا یہی پہلو کیوں نظر آیا اور انھوں نے ایک طوائف کے کوٹھے کو مندر و مسجد سے بہتر بھی بتایا۔ ہو سکتا ہے انھیں مذہب کا پاس بھی نہ ہو کیونکہ کسی بھی مذہب کا ماننے والا کوٹھے کو مندر و مسجد سے بہتر بتانا تو دور کی بات ہے موازنہ کرنا بھی پسند نہیں کرے گا۔ مذہبی امور سے ندا کی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انھوں نے مالتی جوشی سے بھی شادی نہیں کی لیکن ساتھ ساتھ رہے۔ وہ نکاح کو ایک دکھاوا مانتے تھے اور ان کا کہنا تھا کہ ساتھ رہنے کے لیے نکاح نہیں بلکہ ایک دوسرے کو سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے، یہ بات کسی بھی مذہب میں روا نہیں کہ مرد اور عورت ایک ساتھ کسی مذہبی رشتے میں بندھے بغیر رہیں۔ مگر انھوں نے یہ

سب کیا۔ وہ اپنی نظموں، غزلوں اور دوہوں میں انسانیت کا درس دیتے تو نظر آتے ہیں مگر جب اسی انسانیت کو عمل میں لانے کی بات آتی ہے تو اس سے آنکھیں چرا جاتے ہیں اور دوستی کے نام پر مذہب کا کچھ خیال نہیں کرتے۔

وہ نظم ''سچائی'' میں طوائف کے اس کام کو سچائی سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ مختلف مردوں کے ساتھ رہتی ہے اور ہر مرد سے ایک دوسرے کے بارے میں بتاتی ہے وہ اسی کو اس کی سچائی سے تعبیر کرتے ہیں:

وہ کسی ایک مرد کے ساتھ
زیادہ دن نہیں رہ سکتی
یہ اس کی کمزوری نہیں/سچائی ہے
لیکن جتنے دن وہ جس کے ساتھ رہتی ہے
اس کے ساتھ بے وفائی نہیں کرتی
اسے لوگ بھلے ہی کچھ کہیں
مگر! کسی ایک گھر میں
زندگی بھر جھوٹ بولنے سے
الگ الگ مکانوں میں سچائیاں بکھیرنا
زیادہ بہتر ہے۔

یہ بات سچ ہے کہ ندا نے اپنی نظموں میں چھوٹے سے چھوٹے واقعے کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ایک مکمل تصویر سامنے ابھر کر آجاتی ہے۔ ندا ایک مصور کی طرح کسی بھی موضوع کو اٹھاتے ہیں اور اسے تصویر بنا کر اس میں رنگ بھر دیتے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہر فنکار جس فن میں وہ ماہر ہوتا ہے، اپنی فنی مہارت کے ذریعے ہی اپنے فن کی نمائش کرتا ہے۔ فنکار ایسے فنکاری نہیں دکھا سکتا۔ یہ اس پر گزرے ہوئے لمحات اور اس کے احساسات و جذبات ہوتے ہیں جن کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ ایسے ہی کارنامے فنکار اپنے قلم کے ذریعے انجام دیتا ہے وہ بھی کسی ایک موضوع کا انتخاب کر کے شعری جامہ پہنا کر دنیا کے

سامنے پیش کرتا ہے۔ ندا فاضلی نے بھی اپنی نظموں میں ایسے ہی چھوٹے چھوٹے موضوعات کو زمانے کے سامنے لاکر لوگوں کو آئینہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ آج کا زمانہ اتنا پرآشوب ہے کہ لوگ ایک دوسرے کو تعصب کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ ذرا ذرا سی باتوں کو بڑا بنا کر اور جو باتیں ہوئی بھی نہیں ہیں انھیں جھوٹ کا لباس پہنا کر دوسرے مذہب، دوسرے فرقے کو ستایا جا رہا ہے۔ یہ سلسلہ آج نیا نہیں بلکہ قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے۔ ندا فاضلی کو بھی ان حالات سے دو چار ہونا پڑا۔ ان کا دل شاعر اور ایک تخلیق کار کا دل تھا، انھوں نے اس نفرت کو پنپتے دیکھا تو اس کے رد کے لیے اپنی نظموں میں بھائی چارے کا پیغام دیا اور جو ہندوستانی قومی یکجہتی کی تمام عالم میں پہچان ہے اسے لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی، انھوں نے ہندی کے الفاظ اپنی نظموں میں استعمال کر کے اردو نظم نگاری کو نئی سمت سے آشنا کرایا۔ یہی نہیں، انھوں نے اپنی نظموں یا غزلوں کے مجموعے دیوناگری میں بھی شائع کرائے۔ مور ناچ، آنکھوں بھر آکاش، کھویا ہوا سا کچھ، سفر میں دھوپ تو ہوگی، ہم قدم، اور زندگی کی طرف یہ دیوناگری میں شائع ہونے والے مجموعے ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں میں پیش کئے گئے درد کو کوئی شناخت نہ دی بلکہ انہوں نے درد میں تمام انسانوں کا درد دیکھا خسرو، کبیرداس، گرونانک، میرابائی، قلی قطب شاہ، نظیر اکبرآبادی، اور ٹیگور کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب اور قومی یکجہتی سمائی ہوئی ہے اور ان شعراء کی شاعری سے ہندوستانی مٹی کی خوشبو آتی ہے۔ اسی سلسلے کو ندا فاضلی نے آگے بڑھایا۔

ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کو انھوں نے جس طرح سے اپنی نظموں میں پیش کیا ہے وہ انھیں اپنے معاصرین میں منفرد بناتی ہے۔ ان کے اس اسلوب سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ایک حساس دل شاعر معاشرے کو آپسی بھائی چارے کا پیغام کس طرح دے سکتا ہے۔ انھوں نے فرقہ پرست طاقتوں سے خوف نہیں کھایا اور کسی کی کوئی پروا کئے بغیر اپنے احساسات وجذبات کو شاعری میں پیش کیا۔

ہندی اردو الفاظ کو انھوں نے جس طرح اپنی نظموں میں پیش کیا ہے وہ ان کے معاصرین میں کہیں اور نظر نہیں آتا۔ شاید یہی وجہ رہی ہے کہ انھیں ہندی اور اردو

دونوں میں یکساں مقام حاصل رہا ہے۔ وہ اردو مشاعروں کے ساتھ ساتھ ہندی مشاعروں اور سمیناروں میں بھی شرکت کرتے رہے ہیں۔
ندا فاضلی کے معاصرین میں اس طرح کی شاعری یا اسلوب کے نمونے نہیں ملتے۔ انھوں نے ہندی اور اردو الفاظ کی آمیزش سے نظموں میں ایک پر کیف فضا کی تشکیل کی ہے۔

ندا فاضلی کے بارے میں بڑے وثوق کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ نہ صرف برِ صغیر ہندوستان و پاکستان میں بلکہ دنیا کے کسی بھی کونے میں جس جگہ کوئی بھی اردو زبان کو جاننے والا، سمجھنے والا، پڑھنے والا اور اردو سے محبت کرنے والا شخص موجود ہے وہاں ان کا نام بڑے ادب واحترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ ان کا کلام محبت سے سنا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں انسانیت پر خاصا دھیان دیا ہے وہ اکثر غالب کا یہ شعر:

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

دورانِ گفتگو دہراتے رہتے تھے، اسی ایک شعر سے انھوں نے انسانیت کے راز کو جاننے کی کوشش کی۔ ان کے گھر کا ماحول واقعی شاعرانہ تھا ان کے والد دعا ڈبائیوی بھی ایک مشہور شاعر تھے۔ ندا کو وراثت میں گھر کا ادبی ماحول ملا۔ گھر اور باہر کے ماحول میں تھوڑا سا فرق تھا، گھر کے اڑتے پرندے، بیچ سڑک پر حکمرانی چلاتے ہوئے نندی بیل تھے۔ گھر کے سامنے ایک املی کا پیڑ تھا۔ اس کے پچھواڑے ایک نیم کا پیڑ تھا۔ یہ نیم کا پیڑ اور وہ املی کا درخت وہ پنچھی اور وہ نندی کا بیل جو ان کے دیکھے ہوئے تھے وہ اس وراثت سے میل نہیں کھاتے تھے جو انھیں اپنے گھر سے ملی تھی۔ ان کا لگاؤ تو چلتی پھرتی زندگی اور روزمرہ پیش آنے والے معمولی واقعات سے تھا۔ یہ راستہ اپنانے میں انھیں کئی موڑوں سے گزرنا پڑا۔ انھیں ایک بات اکثر محسوس ہوتی رہی کہ جو دیکھا ہوا ہے وہ ہماری شاعری میں نظر نہیں آرہا، اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ شاعری جو انھیں ورثے میں ملی تھی وہ اچھی تھی اور خوبصورت بھی تھی لیکن اس میں زمین سے جڑے ہوئے مسائل کی عکاسی نہیں تھی۔ ان

کا لگاؤ جب دوسری زبانوں سے ہوا اور خاص طور سے ہندوستانی زبانوں کے شاعر جیسے، کبیر، نظیر، میرا، سورداس سے تو ان کے ذہن میں شاعری کا ایک نیا تصور ابھرا۔ ہماری شاعری کا ایک بہت بڑا حصہ ہندوستان کی آبادی کے چھوٹے سے حصے کے اردگرد گھومتا رہا ہے اور وہ بڑا حصہ اس چھوٹے حصے سے باہر رہا۔ اس بڑے حصے سے نکلے ہوئے جو لوگ تھے جیسے کبیر، سورداس، میرا اور نظیر وغیرہ ان کو ہمارے اشرافیہ طبقے نے بھی قبول نہیں کیا۔ نظیر کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ اس زمانے کے رائج موضوعات کو نہیں برت رہے تھے۔ وہ ککڑی، ریچھ کا بچہ، میلہ، تیوہار پر نظمیں لکھتے رہے اور ان کے ذہن میں ایسی کشادگی بھی تھی کہ وہ بیک وقت نانک کے گیت بھی گاتے تھے، رام کو بھی یاد کرتے تھے اور چشتی کی بھی بات کرتے تھے۔ اس وقت کی شاعری عشق و عاشقی کے اردگرد گھومتی تھی۔ نظیر نے اس سے بغاوت کی اور روٹی والی نظم لکھ ڈالی۔ نظیر، کبیر جیسے شعراء نے قومی یکجہتی اور بھائی چارے کا جو پیغام دیا اسی سلسلے کو ندا فاضلی نے آگے بڑھایا ہے۔

☆☆☆

پہلے تلاشا کھیت، پھر دریا کی کھوج کی
باقی کا وقت گیہوں کے دانوں میں بٹ گیا
(ندا فاضلی)

سماجی اور آفاقی موضوعات

ٹکنالوجی یا سائنس کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جن کے ذریعے آج انسان نے ناممکن کاموں کو بھی ممکن کر دیا ہے۔ بغیر ٹکنالوجی یا سائنس کے آج کی دنیا میں انسان نہیں رہ سکتا۔ اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ یہ سب ذرائع ہی ہیں، مقصود بالذات نہیں۔ ان کے ذریعہ ہم انسانیت کی بھلائی کے تمام کام کرسکتے ہیں۔ لیکن اگر ہم ان کا استعمال انسانیت کی بربادی کے لیے کریں تو پھر یہ انسان کی نادانی ہے۔ ٹکنالوجی اور سائنس انسان کے خدمت گزار ہیں، یہ مالک نہیں۔ یہ تو صرف انسان کے حکم کے تابع ہیں جیسا کام انسان ان سے لینا چاہے گا یہ وہی کام انجام دیں گی۔ انسان چاہے ان سے عالم انسانیت کی بھلائی کا کام لے یا اسے نقصان پہنچانے کا۔

انسان کو چاہئے کہ ہمیشہ دنیا اور انسان کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرے۔ اگر دنیا اور انسان کو زندہ رکھنا ہے تو ٹیکنالوجی اور سائنس کی باگ ڈور اخلاقی اقدار کے ہاتھ میں سونپ دینی چاہئے تاکہ ان کا غلط استعمال نہ ہو۔ اگر ٹیکنالوجی اور سائنس میں اخلاقی اقدار کی آمیزش کردی جائے تو اس سے تمام عالم انسان کا بھلا ہوگا اور انسان انسان سے محفوظ رہے گا۔ اگر مادہ پرستی اور خودغرضی کا شر اس میں ملا رہا تو خدانخواستہ وہ دن دور نہیں جب خدا کی اس

خوبصورت زمین اور نسل انسانی کا خاتمہ ہوجائے۔

ندا فاضلی نے قومی اور بین الاقوامی مسائل وموضوعات کو اپنی نظموں میں جگہ دی اور نسبتاً ایک وسیع تناظر عطا کیا۔ان کی نظمیں کسی جذباتی انتہا پسندی یا لسانی انتہا پسندی کے سبب وجود میں نہیں آئیں بلکہ ان میں ایک طرح کی تازگی اور انوکھا پن نظر آتا ہے۔ان کی بعض نظموں میں ناسٹیلجیا (Nostalgia) بھی کارفرما ہے۔وہ اس کے شکار ہوئے اور بہت اتار چڑھاؤ کے بعد انھوں نے خود کو سنبھالا، اسی ہجرت کے درد کو انہوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ ان کے تجربات ومشاہدات میں حقیقت جوئی اور حقیقت کیشی نمایاں ہے اور عصری مسائل کا احساس اور شعور بھی ہے۔

تخلیق قدرت کا ایک عطیہ ہے جو کبھی کبھی اور کسی کسی پر نازل ہوتا ہے۔ یہ انسان کی دسترس میں نہیں ہے۔ اگر یہ انسان کی دسترس میں ہوتا تو کوئی ادیب، شاعر یا آرٹسٹ اپنی مرضی سے دوسرے درجے کا شاعر، ادیب یا آرٹسٹ بننا پسند نہیں کرتا۔

ندا فاضلی کی نظموں کی بنیاد حقیقت پر ہے۔ بقول محمود شاہد ''سچ اپنے اظہار کے لیے نہ مشکل اور نہ ثقیل الفاظ کا تقاضا کرتا ہے اور نہ ہی تشبیہہ واستعارہ کا تعاون چاہتا ہے۔ سچ سادہ اور سلیس زبان میں اپنا اثر دکھاتا ہے''۔ ندا فاضلی اس حقیقت پر مبنی اظہار پر کھرے اترتے ہیں۔انھوں نے اس اظہار کے لیے بالکل سادہ اور سلیس رواں زبان کا استعمال کیا ہے زبان کا یہی استعمال انھیں اپنے ہمعصروں میں انفرادیت بخشتا ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں اتنی ہی باتیں لکھی ہیں جتنی وہ آسانی کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں۔ نہ تو وہ شعر کی تخلیق کے وقت خود پریشان ہوتے ہیں اور نہ ہی قاری کو پریشان ہونے دیتے ہیں۔ سیدھے خیالات کو سیدھے الفاظ اور آسان اسلوب میں بیان کرنا ہی ان کی پہچان ہے۔ انھوں نے عشق ومحبت کو بھی بغیر کسی جذبات واحساسات کے اپنے اشعار میں پیش کیا ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ انھوں نے کسی بھی موضوع کو برتنے میں احتیاط سے کام نہیں لیا۔ جو بھی ان کو محسوس ہوا اسے ویسا ہی سادے الفاظ میں پیش کردیا۔ یہ سادگی ان کی شخصیت میں بھی شامل رہی ہے۔ وہ دکھاوے اور بناوٹ میں ذرہ برابر بھی یقین نہیں رکھتے۔ کسی بھی نظم میں ان کی

زبان بوجھل ہوتی نظر نہیں آتی۔ بلکہ اس میں ایک طرح کا تسلسل و ربط پیدا ہو گیا ہے۔ کتنا بھی مشکل اور پیچیدہ خیال ہو وہ اسے ایسی فنکاری کے ساتھ سادہ الفاظ کا لباس پہنا کر شعری پیکر میں ڈھال دیتے ہیں کہ پیچیدگی کا احساس ذرا بھی نہیں ہوتا۔ ندا فاضلی کو یہ فضا اخلاقی اور تہذیبی اقدار نے بخشی ہے۔ انھوں نے اپنے زخمی احساسات وجذبات کا اظہار دلآویزی کے ساتھ کیا ہے۔ ان کی اکثر نظموں میں ان کی طرز اور ان کے اسلوب نگارش کا جو پیکر ابھرتا ہے اس میں ان کی فکر کی وسعت، زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی اور معنی کی تلاش نمایاں ہے۔ ان کی شاعری فکر و نظر کی پختگی کے سبب فیشن پرستی سے کوسوں دور ہے۔

ندا فاضلی کی اکثر نظمیں جیسے۔ ''نئے گھر کی پہلی نظم''، ''محبت''، ''گلاب کا پھول''، ''پیسے کا سفر''، ''سماجی شعور''، ''تماشا''، ''کامیاب آدمی''، سونے سے پہلے''، اپنے اندر سماجی موضوعات کو سمیٹے ہوئے ہیں، سماجی شعور کا احاطہ کرتے ہوئے نظم ''گلاب کا پھول'' پیش ہے:

لچکتی ڈال پہ کھلتا ہوا گلاب کا پھول
لبوں کے خم، جھکی آنکھوں کی بولتی تصویر
نئی نئی کسی بچے کے ہاتھ کی تحریر
لچکتی ڈال پہ کھلتا ہوا گلاب کا پھول
حسیں لباس میں ماتم حیات فانی کا
نظر کے سامنے انجام ہر کہانی کا
لچکتی ڈال پہ کھلتا ہوا گلاب کا پھول
بہن کی شوخ ہنسی ماں کے پیار کا درپن
چھلکتی یادوں میں بھیگا ہوا اکیلا پن
لچکتی ڈال پر کھلتا ہوا گلاب کا پھول
ہر ایک ذہن میں نقشا بدلتا رہتا ہے
شبیہہ ایک ہے پردہ بدلتا رہتا ہے

ندا فاضلی کی اس نظم میں فکر واحساس کی تمازت کے علاوہ ہلکے ہلکے طنز کی ایک زیریں لہر بھی جگہ جگہ نظر آتی ہے جو نظم کو انفرادیت بخشتی ہے۔ اس طرح کی دوسری نظموں میں بھی طنز کی یہ لہر زندگی کے تلخ وترش تجربوں سے غیر شعوری طور پر ان کے کلام میں در آئی ہے۔ لیکن اس سے ایک نئی فکری جہت کا اضافہ بھی ہوا ہے اور نظموں میں گہرائی و گیرائی بھی پیدا ہوگئی ہے۔

اسی سلسلے کی ان کی ایک اور نظم ''کامیاب آدمی'' ہے، جس میں انھوں نے سماج میں انسان کی چھوٹی چھوٹی حرکات کو نشانہ بنایا ہے۔ نظم مختصر ہے:

وہ گالی کھاکے مسکراتا ہے

ہر ذلت کو بھول جاتا ہے

ہر ایک کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے

اسے کامیابی کا راستہ مل گیا ہے

وہ بہت جلد

دوسروں کو ستانے کے قابل ہو جائے گا

اس نظم میں ندا فاضلی نے سماج کی اس عادت کو پیش کیا ہے جب سماج برے اور بارسوخ، جھوٹے اور فریبی انسان کو رتبہ دیتا ہے۔ آج کا عہد یہ ہے کہ اپنے کام کے لیے انسان کسی بھی حد تک نیچے گر سکتا ہے۔ وہ گالیاں کھاکے بھی خاموش رہتا ہے اور ہر ذلت کو سہہ جاتا ہے، وہ سبھی کی باتوں کو سن کر ان کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے۔ ندا فاضلی نے آدمی کی اس صفت کو کامیابی کی صفت بتا کر پیش کیا ہے۔ ندا فاضلی سماج کی رگ رگ سے واقف ہیں، انھوں نے سماج سے اپنا رشتہ استوار رکھا ہے اور بالواسطہ طور پر اسی سے اپنی نظم کا مواد حاصل کیا ہے۔

ندا فاضلی کی ایک اور نظم جس کا عنوان ہی ''سماجی شعور'' ہے، ان کے سماجی موضوع پر لکھی گئی نظموں میں اہمیت کی حامل ہے۔ نظم ملاحظہ ہے:

میرے یار چور

ہر کام میں سلیقے کی ضرورت ہوتی ہے
تم چھوٹی موٹی چیزیں چراتے ہو
اور جیل چلے جاتے ہو
لیڈر
منسٹر
سرکاری افسر
یہ سب تمہارے ہی جیسے انسان ہیں
لیکن تم
سماجی شعور سے کوسوں دور ہو
اسی لیے چور مشہور ہو

بالکل سیدھے اور آسان پیرائے میں کہی گئی اس نظم میں ندا فاضلی نے چور کی خصوصیت بتائی ہے۔ حالانکہ چور چور ہی ہوتا ہے۔ چاہے وہ چھوٹی چوریاں کرے یا بڑی۔ لیکن سماج میں چھوٹی چوریاں کرنے والے کو چور سمجھا ہے جبکہ بڑی چوریاں جن سے مراد بڑے گھوٹالے، کرپشن وغیرہ ہیں، کرنے والوں کو لوگ چور نہیں کہتے بلکہ عزت دیتے ہیں۔ آج کے دور میں بڑے بڑے تجار حکومت کا پیسہ غبن کر لیتے ہیں اور حکومت بھی ان سے کچھ روز کے بعد اپنا دامن جھاڑ لیتی ہے لیکن انھیں چور نہیں کہا جاتا ان کی عزت سماج میں بنی رہتی ہے۔ جبکہ اس کے برعکس کوئی عام آدمی کسی کے یہاں سے کوئی چھوٹی چیز چرا لے تو اسے چور کا نام دے کر قید خانے میں ڈال دیا جاتا ہے اور ہر قدم پر مطعون بھی کیا جاتا ہے۔ یہ سماج میں پھیلی ایک طرح کی بیماری ہی ہے جو صحیح اور غلط کو نہیں پہچانتے۔ ندا نے سماج پر طنز کر کے ہمارے چاروں طرف پھیلے ہوئے نادانی کے اس پردے کو دکھایا ہے جس سے ہم انجان ہیں۔ ندا فاضلی نے لیڈر، منسٹر اور سرکاری افسروں کے اس فعل کو سماجی شعور سے تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ انھیں یہ سب کرنے کے بعد بھی سماج میں رتبہ اور شہرت مل جاتی ہے۔ اس نظم میں انھوں نے بالکل عام بول چال کے الفاظ استعمال کیے ہیں جس سے شعری آہنگ تشکیل پاتا

ہے۔ یہ ان کی صرف اسی نظم کی خاصیت نہیں ہے بلکہ تمام نظموں میں انھوں نے ایسے ہی الفاظ سے شعری آہنگ پیدا کیا ہے، سماج سے رشتہ برقرار رکھتے ہوئے انھوں نے سماج کی غلط روایات کو اپنی نظموں میں پیش کیا ہے۔ ان کی یہ وابستگی صرف ہندوستانی سماج یا معاشرے تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ہم عصر عالمی معاشرے سے بھی ہے۔ وہ اپنے فن کو زندگی کی حقیقت سے جوڑ کر رکھنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح کی اور بھی نظمیں ہیں جو سماجی حالات پر تبصرہ ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں میں جو بھی کیفیت بیان کی ہے وہ سماجی برتاؤ کی آگہی کو سمیٹے ہوئے ہے۔ وہ اپنی نظموں میں نہ تو ناصح بن کر ابھرے اور نہ ہی مصلح بنکر بلکہ انھوں نے تو صرف سماج اور دنیا کو آئینہ دکھانے کا کام کیا ہے۔ ہمارے بیچ، ہمارے گھروں میں مذہب کے نام پر کیا کیا ہو رہا ہے صرف ان کا کام انھیں بتانا ہے۔ اچھے اور برے کا فیصلہ تو خود قاری کو کرنا ہے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ انھوں نے اپنی تمام شاعری میں توازن برتا ہے، کہیں بھی بلند آہنگی سے کام نہیں لیا اور نہ ہی وہ باغی بنے۔ ہر نظم میں ان کی ہمدردی ابھر کر سامنے آتی ہے۔ یہ ہمدردی کس سے ہے؟ خود نظم کا مطالعہ کرتے وقت قاری کو اس بات کا احساس ہو جاتا ہے۔ وہ سماج سے اپنی ہمدردی رکھتے ہیں۔

ایک نظم جس کا عنوان ''لاپتہ'' ہے، میں ندا فاضلی نے سماج سے رشتے کو کچھ اس طرح بیان کیا ہے کہ جب وہ کہیں جاتے ہیں اور کچھ روز کے بعد وہاں سے کسی دوسری جگہ منتقل ہوتے ہیں تو پہلے چھوڑی ہوئی جگہ کی یادیں ان کے ساتھ رہتی ہیں، وہ پیچھا نہیں چھوڑتیں:

میں یہاں آیا تھا

میرے دوست سارے جانتے ہیں
قہقہے میرے ابھی تک
ہوٹلوں میں
محفلوں میں
مے کدوں میں
سوکھے پھولوں کی طرح بکھرے پڑے ہیں

جو بات اوپر بیان کی گئی ہے وہ نظم کے مندرجہ بالا حصے میں ندا فاضلی نے کس خوش اسلوبی سے پیش کی ہے۔ یعنی جہاں جہاں بھی وہ گئے ہیں وہاں کا منظر وہ اپنے ساتھ لئے پھرتے ہیں اور اپنا عکس وہاں چھوڑ جاتے ہیں۔ یہی عکس انھیں وہاں کی یاد دلاتا رہتا ہے۔ نظم آگے کچھ اس طرح بڑھتی ہے:

مدتوں سے میں بھٹکتا پھر رہا ہوں
کس سے پوچھوں
میں کہاں ہوں

انہی یادوں کی تلاش میں وہ جگہ جگہ بھٹک رہے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان کا کچھ گم ہو گیا ہو اور وہ اسی کی تلاش میں جگہ جگہ گھوم رہے ہوں۔ اسی تلاش و جستجو میں ان کا یہ عالم ہے کہ انھیں اپنا بھی پتہ نہیں کہ میں کہاں آ گیا۔ شاعر کی ذاتی زندگی میں یہ سب کچھ ہوا۔ آگے نظم میں کہتے ہیں:

جگمگاتے شہر کے سنسان رستے میں

شاید
آگ اگلتے سنگ دل سورج نے

مجھ کو
قتل کر کے
گیہوں بوئے کھیت میں دفنا دیا ہے
اب تمہاری یاد بھی شاید نہ مجھ کو ڈھونڈ پائے

میں یہاں آیا تھا

وہ اپنی جگہوں کو چھوڑ کر شہر میں آ گئے ہیں جیسے شہر کی زندگی بہت ہی پیچیدہ ہوتی ہے، اس میں آنے کے بعد آدمی طرح طرح کے کاموں میں کھو جاتا ہے اور اسے اپنا بھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ کون ہے اور کہاں ہے۔ زندگی تیز رفتار سے چلنے لگتی ہے۔ شہر میں وہ اکیلا ہوتا ہے تو اسے ذرا سی پریشانی بھی بہت بڑی معلوم ہونے لگتی ہے۔ اسی طرح اسے شہر کے سورج

کی تمازت سے گھبراہٹ ہورہی ہے جو کہ دھوپ کی شکل میں آگ برسا رہا ہے۔ یعنی شہر کی زندگی، شہر میں کوئی کسی کا ہمدرد نہیں ہوتا اور شہر کی زندگی سنگ دل نظر آرہی ہے۔ اس نے اسے اتنا ستایا ہے یا یہ اتنی بے رحم ہے کہ شاعر اسے خود کو قتل کرنے کے مترادف قرار دیتا ہے۔ قتل کر کے اسے ایسی جگہ دفنایا گیا ہے کہ کبھی بھی اب کسی کی بات کو سن نہیں سکتا۔ مراد یہ ہے کہ شہر کی زندگی میں وہ اتنا گھر گیا ہے کہ اب اس کے پاس کچھ سوچنے اور کسی کو یاد کرنے کا وقت ہی نہیں ہے۔ جب وہ شہر میں آیا تھا تو اسے بھی دوست جانتے تھے لیکن شہر میں آکر وہ اکیلا سا ہو کر رہ گیا ہے۔

اس نظم کا مطالعہ کرتے وقت کئی جہتیں سامنے آتی ہیں۔ جب انسان کو غم و آلام گھیر لیتے ہیں تو وہ بہت پریشان ہو جاتا ہے اور ہر طرف مایوسی کی حالت میں ہی نظریں دوڑاتا ہے۔ اسے ہر طرف مایوسی اور ہر شے بے جان سی نظر آتی ہے۔ کسی بھی شے میں اسے زندگی کی حرارت نظر نہیں آتی۔ اور وہ مایوسی و ناامیدی کے اندھیرے میں گھر جاتا ہے۔ اسی کیفیت کو ندا نے اس نظم میں کچھ ایسے خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے کہ وہ غم ہوتے ہوئے بھی غم نظر نہیں آتا۔ عالمی پیمانے پر انھوں نے چاہے وہ ہندوستان و پاکستان کے رشتے ہوں، فرقہ وارانہ فسادات ہوں، دہشت گردانہ حملے ہوں یا آپسی پھوٹ، مدر ٹریسا ہو یا صدام حسین، ملالہ کی جدوجہد ہو یا اجمل قصاب، سبھی پر اپنی بیباک رائے کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے کبھی یہ بات نہیں سوچی کہ اس سے ان پر کس طرح کی آنچ آئے گی بلکہ انھوں نے کسی بھی موضوع پر بغیر کوئی پروا کیے ہوئے صاف گوئی کے ساتھ لکھ دیا ہے۔ یہی اسلوب انھوں نے اپنی نثر میں بھی اپنایا ہے۔

ہندوستان و پاکستان کے بیچ جو بھی رشتے رہے ہوں لیکن انھوں نے ان رشتوں کو جس طرح سے محسوس کیا ہے اور اپنی نظم ''پاسپورٹ آفیسر کے نام'' جو اس طرح شروع ہوتی ہے، ''کراچی ایک ماں ہے'' میں پیش کر کے ان رشتوں کو ایک الگ زاویے سے دکھانے کی کوشش کی ہے۔

کراچی ایک ماں ہے

بمبئی بچھڑا ہوا بیٹا

یہ رشتہ پیار کا پاکیزہ رشتہ ہے جسے

اب تک

نہ کوئی توڑ پایا ہے

نہ کوئی توڑ سکتا ہے

غلط ہے ریڈیو، جھوٹی ہیں سب اخبار کی خبریں

نہ میری ماں کبھی تلوار تانے زن میں آئی ہے

نہ میں نے اپنی ماں کے سامنے بندوق اٹھائی ہے

یہ کیسا شور و ہنگامہ ہے

یہ کیسی لڑائی ہے

ہندوستان، اور پاکستان کے بیچ جنگ اور ایک ماں سے ملنے کے لیے بیٹے کی جدوجہد لیکن اس جدوجہد پر یہ جنگ بھاری ہے۔ جنگ کے اس منظر کو زبیر رضوی نے اپنی نظم ''امن سے دشمنی'' میں اس طرح پیش کیا ہے۔

وہی دن کہ جب

آسماں!

تیری آنکھوں میں کالا دھواں

بھر گیا تھا

زمیں! تیرے اندر بڑے زور کا

اک دھماکا ہوا تھا

وہی دن کہ جب

'جنگ' کے لفظ نے

قہقہہ مار کر

'امن سے دشمنی' کا

اعادہ کیا تھا

تب ہی

چہچہاتی ہوئی ساری چڑیوں کے پر

جل گئے تھے

تب ہی چارسو

سانس لیتی ہوئی زندگی

راکھ ہوکر

بکھرنے لگی تھی!

اس آفاقی موضوع کو ندا فاضلی اور زبیر رضوی نے الگ الگ انداز سے برتا ہے۔ ندا فاضلی نے اسے ماں کے رشتے کے ساتھ بیان کرکے اپنی پہچان کو برقرار رکھا ہے۔ یہ ان کی خاصیت ہے کہ انھوں نے ہر موضوع میں انسانی رشتوں کی پاسداری رکھی ہے۔ حالانکہ اس نظم میں جھلاہٹ بھی در آئی ہے جو کہ فطری ہے۔ کیونکہ وہ اپنی ماں سے ملنے پاکستان جانے کے لیے پاسپورٹ بنوانے کے لیے درخواست دیتے ہیں لیکن ہند و پاک کے درمیان جنگ کی وجہ سے یہ درخواست منظور نہیں ہوتی تب ایک بیٹے کے دل کو ملال ہونا لازمی تھا جو کہ ندا کے یہاں جھلاہٹ میں بدل گیا ہے۔

☆☆☆

چھوٹی کرن اذان کی، جاگے پنچھی ڈھور
چڑیوں کی چہکار میں، کرے تلاوت بھور

(ندا فاضلی)

گاؤں شہر اور ہندوستانی تہذیب

یہ بات ہم سبھی جانتے ہیں کہ ہندوستان مختلف تہذیبوں والا دیش ہے۔ جب ہم ہندوستان میں ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے ہوئے جاتے ہیں تو ہم وہاں کے لوگوں کا لباس، رہن سہن، ان کے طور طریقوں کو دیکھتے ہیں جو مختلف ہوتے ہیں۔ ان کی بولیاں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ لیکن یہ سب ایک ہی وطن میں ہوتے ہیں یہ سبھی لوگ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ اور یکجہتی کی مالا میں بندھے ہوئے ہیں جو ہندوستان کی تہذیب کی خاصیت ہے۔

تہذیب کا سیدھا مطلب ہمارے جینے کے طور طریقوں سے ہوتا ہے، ہماری، ہمارے خاندان کی، ہمارے پردیش اور پھر ہمارے وطن کی ایک تہذیب ہے۔ ہندوستان کی تہذیب میں مختلف تہذیبیں سمائی ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری یعنی ہندوستان کی تہذیب سب سے متحرک نظر آتی ہے۔ مختلف تہذیبوں کی آمیزش ہی ہماری تہذیب کو دوسرے ممالک کی تہذیبوں سے ممیز کرتی ہے۔

جینے کے طور طریقوں کے معنی ہمارے رہن سہن، نا ونوش، اور بولیوں سے ہیں۔ یہ سبھی ہماری تہذیب کے مختلف پہلو ہیں۔ آسان الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ سماج کے افراد کی شکل میں ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں سوچتے ہیں وہی ہماری تہذیب

ہے۔ عام طور پر تہذیب میں سماج کی موسیقی، تعلیم، ادب، فلسفہ، مذہب، سائنس اور موسیقی کے میدان میں سماج کی بڑی بڑی کامیابیوں کو شامل کیا جا سکتا ہے جس میں سماجی رسم و رواج، رہن سہن کے طور طریقے اور تیوہار شامل ہیں۔

تہذیب کی ترقی ایک تاریخی سلسلہ ہے، ہمارے اجداد نے اپنے اجداد سے بہت سی چیزیں سیکھی ہیں۔ وقت اور ضرورت کے اعتبار سے ان چیزوں میں انھوں نے ترمیم و اضافہ بھی کیا۔ جو ان کے استعمال میں نہ آئیں وہ آہستہ آہستہ از خود ختم ہو گئیں یعنی چلن سے باہر ہو گئیں۔

اسی طرح تہذیب کا سلسلہ ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔ دنیا میں بہت کم ممالک ہیں جن کی تہذیب ہندوستان کی تہذیب کی طرح ہے۔ ہندوستان میں جتنی بھی زبانیں بولی جاتی ہیں ان کا اپنا الگ شعر و ادب کا اثاثہ ہے۔ یہاں آٹھ بڑے مذاہب کے ماننے والے لوگ ایک ساتھ مل جل کر رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے تیوہاروں کو بھی لوگ مل جل کر ایک ساتھ مناتے ہیں۔

ہماری تہذیب کی Variations کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں مختلف ذات برادری کے لوگوں کی آمیزش ہے، وقت کے ساتھ ساتھ دنیا بھر سے لوگ یہاں آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ انھوں نے کچھ تو اپنے رواج کو عام کیا اور کچھ یہاں کے رواج کو اپنایا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں کئی نسل اور ذات کے گروہ یا قبیلے بنتے چلے گئے۔ ان میں منگول، نیگرو، اور پروٹو آسٹورائیڈ جیسی تہذیبوں کے لوگ بھی ہیں تو دوسری طرف ایرانی اور یونانی جیسی تہذیب کے لوگ بھی ہیں۔ جیسے جیسے یہ لوگ ہندوستان میں آتے گئے ان کے رہن سہن نا و نوش اور ان کے افکار ہماری تہذیب میں شامل ہوتے گئے۔ لکھنؤ کے چکن کا کام، بنگال کی کڑھائی یہ کچھ مثالیں ہیں جو ہماری تہذیب کی کچھ خاصیت اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کی زمین پر مختلف ممالک اور قوموں کے وارد ہونے کے اسی سلسلے کو فراق گورکھپوری نے اپنے اس شعر میں پیش کیا ہے:

سرزمین ہند پر اقوام عالم کے فراقؔ
قافلے بستے گئے ہندوستاں بنتا گیا

ہندوستان میں مختلف افکار و نظریات اور عادات و اطوار کے لوگ رہتے ہیں۔ایسے میں کسی بھی ایک نظریہ کے لوگوں کا تسلط ناممکن ہے۔ ہندوستان میں ہندو مسلم سکھ،عیسائی، بودھ،جین اور پارسی مذہب کے ماننے والے رہتے ہیں اسی لئے ہند کے آئین نے ہرایک کوآزادی کے ساتھ اپنے اپنے تیوہار منانے اوراپنے اپنے مذہب کی ترقی وترویج کی اجازت دے رکھی ہے۔ہندوستان کی کسی بھی ریاست کا کوئی مذہب نہیں ہے۔

ندا فاضلی کی بہت سی نظمیں ایسی ہیں جو گاؤں،شہراورتہذیب کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ایک دن کی سیر، بھور، سردی، پہلا پانی، چھوٹے شہر کی رات، سنا ہے میں نے، پگھلتا دھواں، سحر، شام، بھوت، گمٹن ، جیب کٹنے کے بعد، بمبئی، راستے کی منطق، میرا گھر، روشنی کے فرشتے اسی قبیل کی کچھ نظمیں ہیں۔

نظم ''ایک دن کی سیر'' میں ندافاضلی نے اپنے گاؤں بھوپال کی ایک تصویر پیش کی ہے۔ نظم ملاحظہ ہو:

اترتی دھوپ کا ایک گول ٹکڑا
ہوا میں ڈولتا پیپل کا پتا
کھلی کھڑکی میں اک گوری کلائی
گلابی اون میں لپٹی سلائی
سڑک کو کاٹتی اک کالی بلّی
اچانک چھٹپٹاتی کوئی لڑکی
منڈیری پر رکھا اک ٹوٹا پنجرا
جھکے چھجے سے گرتا باسی گجرا

نظم کے ان اشعار میں انھوں نے گاؤں کا وہ منظر پیش کیا ہے جب دھوپ نکلنے کا آغاز ہورہا ہےاوروہ پیپل کے پیڑ کے پتوں سے چھن چھن کرزمین پرآرہی ہے۔ پیپل کے پتے پر جب دھوپ پڑ رہی ہےتو اس کا سایہ زمین پر گول دکھائی دے رہا ہے اسی منظرکواگلے شعرمیں اس طرح بیان کیا ہے۔کھڑکی کھلی ہوئی ہےاوراس میں سے کسی گوری

لڑکی کی کلائی نظر آرہی ہے جو اپنے ہاتھوں میں گلابی اون اور سلائی لیے ہوئے ہے، یعنی وہ کچھ بُن رہی ہے۔ عام طور پر گاؤں شہروں میں جب عورتیں فراغت پالیتی تھیں تو وہ اپنے وقت کا صحیح استعمال کرنے کے لیے خالی وقت میں دیگر عورتوں کے پاس بیٹھ کر یا گھر میں اکیلے رہ کر بنائی کیا کرتی تھیں۔ یہی منظر ندا نے اس نظم کے اس حصے میں پیش کیا ہے سڑک پر سفر کرتے ہوئے یا گلی سے گزرتے ہوئے کوئی کالی بلّی گزر جاتی ہے تو راہ گیر ایک دم اچانک رک جاتا ہے۔ اسے عام زبان میں ''بلّی کا راستہ کاٹنا'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ گاؤں میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ جگہ جگہ گھروں میں کچھ پرندے یا جانور ضرور پالے جاتے ہیں۔ پرندے رکھنے کے لیے پنجروں کا استعمال کیا جاتا ہے اور اسے گھر کی منڈیروں پر رکھا جاتا ہے یا دالان میں لٹکایا جاتا ہے۔ گاؤں میں یہ سب کچھ زندگی کا حصہ ہوتے ہیں اور لوگ انھیں بڑے پیار سے اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ لڑکیاں اپنے بالوں میں پھولوں کی مالا ڈالتی ہیں۔ یہ مالا الگ طرح کی ہوتی ہے جو بالوں میں لپیٹی جاتی ہے جسے گجرا کہا جاتا ہے۔ یہ گجرا تازہ پھولوں کا بنتا ہے۔ ایک دن گزرنے کے بعد پھول مرجھا جاتے ہیں تو لڑکیاں یہ مالا الگ جگہ ڈال دیتی ہیں۔ گاؤں میں کمرے کے آگے دروازے کے اوپری حصے پر ذرا سی جگہ نکلی ہوتی ہے جسے چھجہ کہتے ہیں۔ اس چھجے کے دو کام ہوتے ہیں ایک تو کمرے میں دھوپ یا بارش کا پانی نہیں آپاتا اور دوسرے اس پر ضروری اور غیر ضروری چیزیں رکھ دی جاتی ہیں۔ مکانات خستہ ہونے کی وجہ سے یہ جھک بھی جاتے ہیں۔ اسی چھجے پر لڑکی نے اپنا باسی گجرا ڈال دیا ہے اور وہ آدھا نیچے کی طرف گرتا ہوا نظر آرہا ہے۔ نظم آگے اس طرح بڑھتی ہے:

یہ دھندلی دھندلی بے معنی لکیریں
بہ ظاہر کچھ نہیں مفہوم جن کا
ہنسی آئے گی میرے دوستوں کو
اگر میں ان کو کوئی نام دے دوں
گذشتہ ماہ کا بھوپال کہہ دوں

ندا فاضلی کی یادوں میں بسا ہوا ان کا گزرا ہوا زمانہ اور اس کی تصاویر ان کے ذہن پر چھائی ہوئی ہیں۔ حالانکہ ان کا اب کوئی مطلب نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر میں اپنی یہ ساری باتیں اپنے دوستوں کو بتاؤں تو یہ ممکن نہیں کہ وہ ان باتوں کی اہمیت کو سمجھ سکیں۔ بلکہ وہ میری باتوں پر ہنسیں گے۔ اس سارے منظر کو وہ سمجھ بھی نہیں پا رہے ہیں کہ آخر اسے کیا نام دیا جائے۔ آخر میں وہ ان باتوں کی بنیاد کو ہی اس کا نام دیتے ہیں اسے گزرے ہوئے وقت کا بھوپال سے تعبیر کرتے ہیں۔

بظاہر یہ نظم مختصر اور عام فہم ہے لیکن اس میں مختلف تصویریں بکھری ہوئی ہیں اور ہر تصویر اپنے اندر ایک داستان سمیٹے ہوئے ہے۔ اگر ہم اس نظم کو کولاژ کہیں تو غلط نہ ہوگا کیونکہ چھوٹی چھوٹی تصاویر سے مل کر یہ نظم مکمل ہوتی ہے۔ اس طرح کی مثالیں ندا فاضلی کی اور دوسری نظموں میں بھی مل جاتی ہیں۔

نظم ''بھور'' میں ندا فاضلی نے گاؤں کی صبح کی تصویر پیش کی ہے۔ جب گاؤں میں لوگ علی الصبح ہی جاگ کر اپنے کام دھندوں میں لگ جایا کرتے تھے اور چاروں طرف سے مختلف کام کرنے کی آوازیں آنے لگتی تھیں۔ عورتیں صبح کی عبادت کے بعد ہی چکیاں چلانے لگتی تھیں لوگ اپنے بھینسوں، گائیوں اور دوسرے جانوروں کو چارا کھلانے لگتے تھے۔ نظم میں گائے اپنے بچھڑے کا منہ چاٹتی ہوئی نظر آرہی ہے اور آخر میں دھیرے دھیرے صبح نمودار ہوتی ہے اور پھر دھوپ نظر آنے لگتی ہے۔ اس نظم میں انھوں نے گاؤں کی تصویر پیش کی ہے۔ اگر ہم ان کی نظموں کو چھوٹی چھوٹی تصویریں کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ نظم کے اس حصے میں ہندوستانی تہذیب کا عکس ابھرتا ہے اور پھر ہندوستان کی سچی تصویر سامنے آجاتی ہے۔۔ نظم ملاحظہ ہو:

گونج رہی ہیں
چنچل چکیاں

ناچ رہے ہیں سوپ
آنگن آنگن

چھم چھم چھم چھم

گھونگٹ کاڑھے روپ

ہولے ہولے

بچھیا کا منہ چاٹ رہی ہے گائے

دھیمے دھیمے

جاگ رہی ہے

آڑی ترچھی دھوپ

نظم ''سردی'' میں انھوں نے گاؤں کی سردی کا منظر پیش کیا ہے۔

کہرے کی جھینی چادر میں

جوبن روپ چھپائے

چوپالوں پر

مسکانوں کی آگ اڑاتی جائے

گاجر توڑے

مولی نوچے

پکے ٹماٹر کھائے

گودی میں اک بھیڑ کا بچہ

آنچل میں کچھ بوٹ

دھوپ سکھی کی انگلی پکڑے

ادھر ادھر منڈلائے

شہروں کے مقابلے میں گاؤں میں سردیوں میں کہرا زیادہ ہوتا ہے۔ جب صبح کو سورج نمودار ہوتا ہے تو وہ گھنا کہرا دھوپ کو زمین تک نہیں آنے دیتا۔ گاؤں کی چوپال، جس پر گاؤں کے بزرگ لوگ بیٹھ کر طرح طرح کی باتیں سناتے تھے اور بچے جوان ان کے چاروں طرف کھڑے ہو کر ان کی باتیں سنا کرتے تھے۔ اور گاؤں کا وہ منظر کون بھول

سکتا ہے جب کھیتوں سے گاجر چرا کر بچے کھالیا کرتے تھے اور کوئی بھی برا نہیں مانتا تھا۔ یہ بھی منظر کہ جس لڑکی کا ذکر وہ مولی، گاجر اور ٹماٹر کے ذیل میں کرتے ہیں اس کی گود میں ایک بھیڑ کا بچہ بھی ہے اور وہ چاروں طرف چہچلتا کے ساتھ گھوم رہی ہے۔ اس نظم میں بھی ندا فاضلی نے گاؤں کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرکے ہندوستانی تہذیب کو زندہ رکھا ہے۔ اس نظم میں انھوں نے محبوبہ کا سراپا بھی بیان کیا ہے لیکن یہ اتنی سادگی اور خوبصورتی کے ساتھ کیا گیا ہے کہ قاری کو سرسری طور پر اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ اسی طرح ''پہلا پانی'' اور ''نیا دن'' میں بھی انھوں نے گاؤں کے گھروں اور گاؤں کی زندگی کی بھرپور عکاسی کی ہے کہ کس طرح برسات کے دنوں میں گھروں میں پانی ٹپکتا ہے یا یہ کہیے کہ گھر کے آنگن کے منظر کو ہی سامنے لاکر کھڑا کر دیا ہے۔ گاؤں کی اتنی خوبصورت تصویریں پیش کرکے ندا فاضلی نے اپنی تخلیقی ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے۔ نظم پہلا پانی ملاحظہ کیجئے:

چھن چھن کرتی ٹین کی چادر

سن سن بجتے پات

پنجرے کا توتا دہراتا

رٹی رٹائی بات

مٹھی میں دو جامن

منہ میں ایک چمکتی سیٹی

آنگن میں چکر کھاتی ہے

چھوٹی سی برسات

وہ اپنی نظموں کا تانا بانا گاؤں کی ہی اشیاء سے بُنتے ہیں جس سے ان کی نظمیں تصنع اور توہم پرستی سے آزاد ہوتی ہیں اور ان کی شاعری کا رشتہ گاؤں کی فضا اور ہندوستانی تہذیب سے جڑ جاتا ہے۔ نظم ''چھوٹے شہر کی رات'' میں انھوں نے شہر کی عکاسی بہت ہی مختصر مگر حقیقی انداز میں کی ہے۔ نظم کا کچھ حصہ ملاحظہ ہو:

فٹ پاتھوں پہ اونگھ رہی ہیں تھکی تھکائی گائیں

پیڑوں میں دبکی بیٹھی ہیں چنچل سائیں سائیں
بیڑی میں گانجا بھرنے بیٹھی ادھ ننگی سردی
منہ ہی منہ میں گالی دیتی گزری خاکی وردی

نظم کے اس حصے میں انھوں نے شہر کی اس شام یارات کا ذکر کیا ہے کہ جب سردی ہو رہی ہے اور شہر کی آوارہ گائیں جو چاروں طرف گھومتی رہتی ہیں فٹ پاتھ پر آکر تھکی ماندی حالت میں آدھی سوئی اور آدھی جاگی حالت میں ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ شہر کے مصروف چوراہوں یا سڑک کنارے پر یا پھر فٹ پاتھوں پر لوگ جانوروں کے لیے کچھ کھانے پینے کی اشیاء ڈال دیتے ہیں جس سے وہ جانور اپنا پیٹ بھر لیتے ہیں، یہ وہی منظر ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں اور وہیں دوسری طرف شہر کے آوارہ منش لڑکے، آدمی اپنی تھکن دور کرنے کے لیے اور کچھ مصنوعی طاقت حاصل کرنے کی غرض سے اپنی بیڑیوں میں گانجا بھر رہے ہیں۔ یہ بالکل حقیقی تصویر ہے اس کا مشاہدہ گھر بیٹھے یا کتابوں کو پڑھ کر نہیں بلکہ خود وہاں جا کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ آگے کے مصرعے میں انھوں نے پولس کا چہرہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ وہ شام ہوتے ہی شہر میں ادھر ادھر حفاظتی مقصد کے لیے گشت کرتے ہیں۔ پولس والے وہاں یہ سب دیکھ کر انھیں روکنے یا نصیحت کرنے کے بجائے انھیں گالی دیتے ہوئے گزر جاتے ہیں اور وہ اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ ان کا روز کا معمول ہے اور پولس اس میں ذرا بھی مداخلت نہیں کرتی یہ ایک تصویر شہر کی ہے جو انھوں نے اپنے قلم کی جولانی سے ہمارے سامنے پیش کی ہے۔

"پگھلتا دھواں" میں ندا فاضلی نے گاؤں کا منظر بچپنے کے احساس کے ساتھ پیش کیا ہے اور ایک الگ ہی سماں باندھا ہے۔ نظم ملاحظہ ہو:

دور شاداب پہاڑی پہ بنا اک بنگلہ
لال کھپریلوں پہ پھیلی ہوئی انگور کی بیل
صحن میں بکھرے ہوئے مٹی کے راجا رانی
منہ چڑاتی ہوئی بچوں کو کوئی دیوانی

گاؤں کے جنگل کا منظر جس میں پہاڑی پر ایک بنگلہ بنا ہوا ہے۔ اس پہاڑی پر سبزا بھی اگا ہوا ہے۔ بنگلے پر جو کھپریلیں ہیں ان کا رنگ بھی لال ہے اور اس پر انگور کی بیل پھیلی ہوئی ہے۔ آنگن میں بچوں کے کھیلنے کے لیے جو مٹی کے کھلونے بنے ہوئے ہیں وہ پھیلے ہوئے ہیں اور ساتھ میں یہ بھی ڈر ہے کہ کوئی جن بھوت ہے جو ڈرا رہا ہے۔ یعنی یہ ڈر نہ ہوتے ہوئے بھی ہوتا ہے بچپن کا وہ منظر جو میں نے خود دیکھا ہے۔ مٹی کے کھلونے بنا کر بھائی بہنوں اور دوستوں کے ساتھ کبھی تو ان کو گڈا گڑیا بناتے تھے اور کبھی انہی کو راجہ رانی کا نام دے دیا کرتے تھے۔ اس کھیل میں جو مسرت حاصل ہوتی تھی وہ ناقابل بیان ہے۔ ندا فاضلی نے اس میں گاؤں یعنی دیہات کی جو تصویر ابھاری ہے وہ دل پر ایک طرح کا اثر چھوڑ جاتی ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں ان کی نظموں کا خمیر ہندوستانی مٹی سے ہی تیار ہوا ہے۔ نظم آگے اس طرح بڑھتی ہے:

سیب کے اجلے درختوں کی گھنی چھاؤں میں
پاؤں ڈالے ہوئے تالاب میں کوئی لڑکی
گورے ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے تکیے کا غلاف
ان کہی باتوں کو دھاگوں میں سیئے جاتی ہے
دل کے جذبات کا اظہار کیے جاتی ہے

جیسے جیسے نظم آگے بڑھتی ہے اس کی کیفیت میں بھی تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ یہاں پر درختوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک لڑکی کا ذکر بھی آیا ہے کہ وہ اپنے پاؤں تالاب میں ڈالے ہوئے بیٹھی ہے اور اپنے گورے گورے ہاتھوں سے تکیے کا غلاف سی رہی ہے۔ دراصل یہ سلائی تو صرف ایک بہانہ ہے اس کا مقصد گھر سے باہر آنا اور تالاب میں اپنے پاؤں ڈال کر بیٹھنا ہے۔ اکثر لڑکیاں اپنے دل کی کیفیت کو چھپانے کے لئے شرماتے ہوئے اپنے دوپٹے یا اپنے بالوں کی لٹکی ہوئی لٹوں کو اپنی انگلیوں میں اسی طرح لپیٹتی رہتی ہیں یا اپنے دانتوں تلے انگلی دباتی ہیں۔

گرم چولہے کے قریں بیٹھی ہوئی اک عورت
ایک پیوند لگی ساڑی سے تن کو ڈھانپے
دھندلی آنکھوں سے مری سمت تکے جاتی ہے
مجھ کو آواز پہ آواز دیے جاتی ہے
اک سلگتی ہوئی سگریٹ کا بل کھاتا دھواں
پھیلتا جاتا ہے ہر سمت مرے کمرے میں

اب دیکھیے اس حصے میں انھوں نے ایک ہندوستانی عورت کا ذکر کیا ہے یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس میں انھوں نے اپنی ماں کا عکس پیش کیا ہے۔ گھر میں چولہے کے پاس ایک عورت بیٹھی ہوئی ہے جو اپنے بدن کو ایک پیوند لگی ہوئی ساڑی سے ڈھکے ہوئے ہے۔ اور دھندلی آنکھوں کا ذکر انھوں نے بڑے گہرے پس منظر میں کیا ہے۔ جب عورتیں چولہے کے پاس بیٹھی ہوتی ہیں اور آگ جل رہی ہوتی ہے تو آنکھیں دھوئیں کی وجہ سے لال ہو جاتی ہیں اور ان میں سے آنسو بھی نکلنے لگتے ہیں جس کی وجہ سے سب کچھ دھندلا دھندلا نظر آتا ہے۔ انہی آنکھوں سے وہ میری طرف دیکھ رہی ہے اور آواز دے رہی ہے۔ اور وہ سگریٹ پیتے ہوئے دھواں اڑانے میں مصروف ہے جو ان کے چاروں طرف کمرے میں پھیلتا جا رہا ہے۔ اس نظم میں ندا فاضلی نے دو طرح کے دھوؤں کا ذکر کیا ہے ایک تو وہ دھواں جو چولہے سے اٹھ رہا ہے اور ان کی ماں کی آنکھوں میں چبھن پیدا کر رہا ہے جس سے آنکھوں سے پانی نکل رہا ہے۔ ظاہر ہے اس دھوئیں سے انھیں تکلیف ہوئی ہوگی۔ یعنی یہ دھواں تکلیف اور برداشت کی علامت ہے۔ دوسری طرف سگریٹ کا دھواں ہے جو بے فکری کی علامت ہے۔

نظم ''سحر'' ملاحظہ کیجیے:

سنہری دھوپ کی کلیاں کھلاتی
گھنی شاخوں میں چڑیوں کو جگاتی
ہواؤں کے دوپٹے کو اڑاتی

ذرا سا چاند ماتھے پر سجا کے
چنبیلی کی کلی بالوں میں ٹانگے
سڑک پر ننھے ننھے پاؤں دھرتی
مزہ لے لے کے بسکٹ کو کترتی
سحر مکتب میں پڑھنے جارہی ہے
دھندلکوں سے جھگڑنے جارہی ہے

نظم ''سحر'' میں بھی انھوں نے گاؤں کی صبح کا ذکر بڑے دلکش انداز میں کیا ہے ساتھ ہی اسکول جاتے ہوئے بچوں کی تصویر بھی پیش کی ہے۔ ندا کو بچوں سے خاص لگاؤ تھا۔ انھوں نے بچوں کے لیے بہت سی نظمیں لکھی ہیں۔ یہ نظم ''سحر' بھی انھی کے لیے لکھی گئی ہے۔ نظم ''شام'' اور ''بھوت'' میں بھی انھوں نے گاؤں کے مناظر پیش کیے ہیں۔ چندا ماموں کا ذکر پالنے جھلانے کا ذکر، پتنگ کا ذکر، یہ سب خالصتاً ہندوستانی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اور یہ مناظر ہندوستان کی تصویر پیش کرتے ہیں۔

نظم ''گھٹن'' میں انھوں نے شہر کی مصروف اور محنت کش زندگی کو پیش کیا ہے۔ جب دن میں آدمی گھر سے باہر مزدوری کی تلاش میں جاتا ہے اور شام کو واپس آتا ہے، اس کے بعد بھی اپنے گھر میں کام کرنا پڑتا ہے۔ اسی کام اور محنت کو ندا فاضلی نے اپنی اس نظم میں بیان کیا ہے۔ نظم ملاحظہ ہو:

روز ہی رات گئے
ٹین کی اک کھولی سے
بے تکی گالیاں بکنے کی صدا آتی ہے
تھالیاں، پیالے لڑھکنے کی صدا آتی ہے
جانے وہ کون ہے
جو گرم سیہ راتوں میں
اپنے دُکھتے ہوئے ہاتھوں سے

تھکی ٹانگوں سے

دھوپ سے جھلسے ہوئے

سلگے ہوئے تیشوں سے

فرش پر اونگھتے پتھر کی کسی پٹیا کو

چلتی پھرتی نئی مورت میں بدل دیتا ہے

سانولے رنگ کی عورت میں بدل دیتا ہے

اس نظم میں ندا فاضلی نے ایک بُت تراش کی روز مرہ کی زندگی کو پیش کیا ہے جو شہر میں ایک کھولی میں رہتا ہے۔ دن بھر کام کرنے کے بعد جب وہ شام کو گھر واپس آتا ہے تو اسے گھر میں بھی محنت کرنی پڑتی ہے۔ وہ گھر آکر اپنے گھر کے افراد سے لڑتا جھگڑتا ہے برتن، باسن بکھیرتا ہے، گالیاں دیتا ہے اور پھر آخر میں گھر میں پڑے ہوئے پتھر کو تراش کر ایک خوبصورت مورت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس میں مسلسل محنت و مشقت کی تصویر پیش کر کے ندا فاضلی نے زندگی کے مسائل کا بیان کیا ہے کہ کس طرح شہر کی زندگی محنت طلب ہوتی ہے۔ ندا کا یہ تجربہ ذاتی بھی ہے کیونکہ وہ ابتداء میں بمبئی آکر کسی عالیشان مکان میں نہیں رہے بلکہ انھیں بھی اس تنگ کھولی میں رہنا پڑا جو گرمی میں دن کے وقت دھوپ سے تپتی تھی۔ ندا دن میں تو کسی طرح ادھر ادھر جا کر اپنا وقت گزار لیا کرتے تھے لیکن رات آتے ہی وہ اسی کھولی میں آجایا کرتے تھے اور اپنے آس پاس کی دوسری کھولیوں میں ہونے والے واقعات کو وہ دیکھا بھی کرتے تھے اور سنا بھی کرتے تھے۔ جیسا کہ نظم سے ظاہر ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ندا فاضلی نے کھولی میں رہتے ہوئے بھی کبھی نا امیدی اور مایوسی کو پاس نہیں آنے دیا۔ وہ شام کو اپنی کھولی میں واپس آکر اپنے مطالعے میں لگ جایا کرتے تھے۔ اور اسی محنت و لگن سے انھوں نے اپنے مستقبل کی عمارت کھڑی کی اور اسی گھٹن میں جی کر انھوں نے اس سے نکلنے کا راستہ بھی تلاش کیا۔ پوری نظم میں گھٹن کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

"جیب کٹنے کے بعد" نظم میں بھی شہر کی مصروف زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ نظم ملاحظہ کیجیے:

مرے کرتے کی بوڑھی جیب سے کل

تمہاری یاد!

چپکے سے نکل کر

سڑک کے شور وغل میں کھو گئی ہے

بڑی بستی ہے

کس کو فکر اتنی!

کہ کس کھولی میں کب سے تیرگی ہے

یہاں

ہر ایک کو اپنی پڑی ہے

اس میں گاؤں کی یادوں کا حال شہر میں آ کر جو ہوا ہے، بڑے اثر انگیز انداز میں بیان کیا ہے۔ گاؤں کی جو یادیں تھیں وہ اب شہر میں آ کر یہاں کے شور وغل میں گم ہو گئی ہیں یہاں اتنی مصروفیت ہے کہ اتنا وقت بھی نہیں مل پاتا کہ کسی کو یاد بھی کیا جائے۔ شہر اتنا بڑا اور اتنا وسیع ہے، اب ان یادوں کو کہاں تلاش کیا جائے۔ یہاں تو انسان کو خود سے ہی فرصت نہیں ہے۔ وہ خود سے ہی اتنا الجھا ہوا ہے کہ کسی کو یاد کرنے کے لیے وقت ہی نہیں ملتا، اور یہ تو شہر ہے یہاں کوئی کسی کا درد نہیں سمجھتا۔ یہاں تو لوگ صرف اپنے آپ سے ہی مطلب رکھتے ہیں۔ اس نظم میں گاؤں اور شہر کی زندگی کی جو آمیزش ہے وہ اس تبدیلی کی طرف اشارہ ہے جو آج اکثر شہروں میں دیکھی اور محسوس کی جا سکتی ہے۔ بظاہر نظم مختصر ہے لیکن اس میں اتنی وسعت ہے کہ کائنات کے عام انسانوں کے معاشی مسائل بڑے پیمانے پر ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ آج کے دور میں انسانی ہمدردی تو بالکل ختم ہی ہو چکی ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان کا درد سمجھنے کو تیار نہیں ہے۔ یہ بے حسی نہ جانے انسان کو کس گڑھے میں لے جائے گی۔ آج کا انسان دنیاوی تعلیم تو حاصل کر رہا ہے مگر وہ اخلاقی اقدار سے کوسوں دور ہو چکا ہے جو کہ انسانیت کے لیے بہت ہی نقصان دہ ہے۔

اسی مصروفیت اور کشمکش کو ندا فاضلی نے نظم ''بمبئی'' میں بھی دکھانے کی کوشش کی ہے:

یہ کیسی بستی ہے
میں کس طرف چلا آیا
فضا میں گونج رہی ہیں ہزاروں آوازیں
سلگ رہی ہیں ہواؤں میں ان گنت سانسیں
جدھر بھی دیکھو
کھوے، کولہے، پنڈلیاں ٹانگیں
مگر کہیں کوئی چہرہ نظر نہیں آتا

یہاں تو سب ہی بڑے چھوٹے اپنے چہروں کو
چمکتی آنکھوں کو، گالوں کو، ہنستے ہونٹوں کو
سروں کے خول سے باہر نکال لیتے ہیں
سویرے اٹھتے ہی
جیبوں میں ڈال لیتے ہیں

شہری زندگی کا ایک چہرہ کتنی خوبصورت اور حقیقی انداز میں ہمارے سامنے ہے۔ یقینی طور پر یہ کیسی بستی ہے کیسا شہر ہے یہاں آ کر تو چاروں جانب سے شور ہی شور سنائی دے رہا ہے مگر کوئی آواز پہچان میں نہیں آ رہی۔ ہر گلی، ہر راستہ اتنا مصروف ہے کہ ہر طرف بھیڑ ہی بھیڑ نظر آ رہی ہے۔ مگر کسی کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا۔ ہر آدمی کسی ادھیڑ بن میں لگا ہوا نظر آ رہا ہے اور چہرہ پر ایک مصنوعی ہنسی لے کر چل رہا ہے جب کہ ذاتی طور پر وہ ٹوٹا ہوا ہے۔ ایسے میں کسی کی شخصیت کو پہچاننا بہت ہی مشکل ہو گیا ہے۔ کون کیا ہے اور کیا چاہتا ہے کسی کو کچھ پتہ نہیں ہے۔ ہر آدمی اپنی پہچان چھپائے ہوئے ہے۔

عجیب بستی!

اس میں نہ دن، نہ رات، نہ شام
بسوں کی سیٹ سے سورج طلوع ہوتا ہے
جھلستی ٹین کی کھولی میں چاند سوتا ہے

نظم میں ندا فاضلی آگے کہتے ہیں کہ یہ شہر، یہ بستی تو عجیب بستی ہے اس میں نہ دن کا پتہ، نہ رات کا پتہ، نہ شام کا پتہ۔ وقت ریت کی مانند مٹھی سے نکلا جا رہا ہے۔ اور ہم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی رہے ہیں لیکن وقت کو روکنے سے مجبور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں یعنی شہر میں صبح، شام، دن، رات کا کچھ بھی احساس نہیں ہو رہا ہے۔ آدمی صبح سویرے اٹھ کر بسوں میں سفر کرنے لگتے ہیں یہ اتنا طویل سفر ہوتا ہے کہ بسوں میں ہی رات ہوئی اور بسوں میں ہی صبح ہوگئی۔ وقت کی رفتار بہت تیز ہے اور وہ اسی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ وقت نہ تو کبھی کسی کے بس میں ہوا ہے اور نہ ہی ہوگا۔ وقت ریت کی دیوار تو ہوسکتا ہے مگر کہسار نہیں ہوسکتا۔ ریت کی دیوار نظر تو آتی ہے مگر اس کا کوئی دیوار کی حیثیت سے وجود نہیں ہوتا اور وہ پلک جھپکتے ہی ڈھے جاتی ہے۔ نظم کا اختتام کچھ اس طرح ہوا ہے:

یہاں تو کچھ بھی نہیں!
ریل اور بسوں کے سوا
زمیں پہ رینگتے بے حس سمندروں کے سوا
عمارتوں کو نگلتی عمارتوں کے سوا
یہ قبر قبر جزیرہ کسے جگاؤ گے
خود اپنے آپ سے الجھو گے ٹوٹ جاؤ گے
یہاں تو کوئی بھی چہرہ نظر نہیں آتا

اس شہر میں تو ریلوں اور بسوں کے علاوہ کچھ بھی نظر نہیں آتا سمندر ہیں یا پھر عمارتوں کو نگلنے والی عمارتیں۔ یہ شہر تو ایک جزیرہ نما ہے اور ہر محلہ، ہر گلی ہر گھر، ایسا ہے جیسے قبر۔ جس طرح ایک قبر کے مردے کا دوسری قبر کے مردے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، چاہے دوسری قبر میں کچھ بھی ہو رہا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اس شہر میں بھی لوگوں کا حال یہی ہے۔ کسی کو دوسرے کی فکر نہیں۔ ہر آدمی اپنی ہی ذات میں گم ہے۔ یہاں اگر ہر آدمی خود سے ہی سوال کرنے لگے گا تو اور بھی مشکل پیدا ہوگی۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ بس کام کیے جایئے

اور مسلسل آگے بڑھتے جائیے۔ یہاں آپ کو آگے بڑھانے کے لیے کوئی نہیں آنے والا۔ یہ ضرور ہے کہ ہر آدمی آپ کو آگے بڑھنے سے روک تو ضرور سکتا ہے۔ نظم شہر کی زندگی کے مسائل کا احاطہ کئے ہوئے بڑے فکر انگیز انداز میں مکمل ہوئی ہے اور شہری، معاشی زندگی کے ہر پہلو کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ اس نظم سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ندا فاضلی کی اپنے عہد کے تقریباً ہر مسئلے پر گہری نظر تھی۔

اب یہاں ندا فاضلی کی ایک نظم ''مجھے یاد ہے'' پیش کی جارہی ہے۔ اس میں گاؤں کے ماحول کی عکاسی جس احساس کے ساتھ کی گئی ہے وہ اپنے آپ میں نیا احساس ہے۔

مجھے یاد ہے
میری بستی کے سب پیڑ
پربت، ہوائیں، پرندے
مرے ساتھ روتے تھے ہنستے تھے
میرے ہی غم میں
دریا! کناروں پہ سر کو پٹکتے تھے
میری ہی خوشیوں میں
پھولوں پہ
شبنم کے موتی چمکتے تھے
یہیں، سات تاروں کے جھرمٹ میں
لاشکل سی، جو خنک روشنی تھی
وہی! جگنوؤں کی
چراغوں کی، بلی کی آنکھوں کی تابندگی تھی
ندی! میرے اندر سے ہو کر گزرتی تھی
آکاش، آنکھوں کا دھوکا نہیں تھا
یہ بات ان دنوں کی ہے

جب اس زمیں کو عبادت گھروں کی ضرورت نہیں تھی
مجھی میں خدا تھا

اس نظم میں ندا فاضلی نے گاؤں کی تصویر، گاؤں کے پیڑ پودوں کے ساتھ، ہواؤں، پرندوں، پربتوں، خوشبوں، پھولوں، جگنوؤں، چراغوں، ندیوں، بلّی کی آنکھوں کا ذکر کر کے ایک دیہاتی فضا بنا کر پیش کی ہے۔ اس نظم کا مطالعہ کرتے وقت قاری خود کو گاؤں میں ہی پاتا ہے۔ گاؤں کی ان تصویروں کو وہی شخص محسوس کر سکتا ہے جس کا رشتہ (تعلق) ماضی میں گاؤں سے رہا ہے۔ گاؤں کے پیڑ پودوں، پہاڑ، پھولوں سے اتنی انسیت ہے کہ یہ سب ندا کے غم میں ہی روتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ پیڑ پودوں، یہاں تک کہ بے جان چیزوں (پہاڑوں) سے بھی ندا فاضلی کو لگاؤ ہے۔ اس کے برعکس وہ شہر کا دوسرا پہلو پیش کرتے ہیں جس میں انسان انسان کے درد وغم سے بے خبر ہے۔ گاؤں میں یہ باتیں یعنی ہمدردی، انسیت، ایک دوسرے کے غم میں شریک ہونا بہت ضروری ہوتا تھا۔ لوگ انسانی ہمدردی کو ہی عبادت مانتے تھے اور یہی ان کا سب سے بڑا مذہب تھا۔ لیکن آج کا دور یہ ہے کہ لوگوں نے بڑے بڑے مندر اور مسجد بنا لیے ہیں لیکن وہ اس انسانی ہمدردی سے کوسوں دور ہیں۔ آج کا انسان مادہ پرست ہو گیا ہے اسے صرف چمک دمک میں ہی سب کچھ نظر آتا ہے۔ اگر دوسرا شخص صاحب ثروت ہے تو وہ اس سے ہمدردی اپنے مفاد کے لیے دکھائے گا لیکن عام آدمی یا غریب آدمی سے وہ بے تعلق ہی رہتا ہے۔

کسان کے تصور کو ندا فاضلی نے ایک اور نظم جس کا عنوان "تمہیں سلام" ہے میں پیش کیا ہے۔ نظم ملاحظہ ہو:

تم گھر کے آگے کی سڑک کے
چھوٹے سے حصے پر جھاڑو
لگا رہے ہو
تم کھیت میں

تھوڑے سے بیج بکھیر کے

ہل چلا رہے ہو

یہاں انھوں نے ایک عام آدمی کی تصویر پیش کی ہے۔ یہ عام آدمی گاؤں میں بھی ہوسکتا ہے اور شہر میں بھی۔ اکثر اس طرح کی صفات کے آدمی گاؤں میں زیادہ تعداد میں ملتے ہیں جو اپنے گھر کے آس پاس صبح وشام صاف صفائی کرتے ہیں۔ کسان کی تصویر کشی بھی انھوں نے گاؤ ں کے پس منظر میں کی ہے جب کسان اپنے کھیتوں میں بیج بکھیر کر ہل چلاتا تھا یہ سب علی الصبح ہوتا تھا اور بیلوں کے گلے کی گھنٹیاں صبح صبح کانوں میں رس گھولتی تھیں۔ جیسے جیسے زمانہ بدلتا گیا ہل اور بیلوں کی جگہ مشینی آلات نے لے لی اور پھر لوگ ان گھنٹیوں کی آواز سننے کو ترس گئے۔ نظم پھر اس طرح آگے بڑھتی ہے:

تم پاس کی ندی سے

اپنے لئے

گاگر بھر پانی لا رہے ہو

تم حقیقت میں

میلی ہوتی دنیا کے

ایک حصے کو جگمگا رہے ہو

یہاں بھی ندا فاضلی نے عام آدمی کی زندگی کا عکس پیش کیا ہے جب وہ گاؤں میں ہی کسی تالاب یا ندی سے پینے کے لیے پانی بھر کے لاتا تھا۔ یہ ان کا صرف تصور ہی نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے۔ ان سارے کاموں کو ندا فاضلی دنیا کو صاف کرنے کے عمل سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس نظم میں ان کا یہ پیغام ہے کہ آدمی کو فطرت اور قدرت سے اپنا رشتہ بنائے رکھنا چاہئے تبھی فطرت کے ساتھ توازن برقرار رکھا جاسکتا ہے۔ صفائی ایمان کی پہچان ہے۔ ہر مذہب نے صفائی پر زور دیا ہے۔

ندا فاضلی کی نظموں میں گاؤں شہر، خاندانی رشتے اور ہندوستانی تہذیب سے متعلق انور خاں کا یہ قول پیش ہے:

"ندا فاضلی کی شاعری میں خاندانی رشتے ہندوستانی مزاج کی
پوری رنگینی اور عصری انتشار کے ساتھ آتے ہیں، گھر اور
رشتوں کے تصور کو آج کے کسی شاعر نے شاید اس قدر شدت
سے محسوس کیا ہو جس قدر ندا نے" ۔[۱۲]

ندا فاضلی کی نظموں میں ہندوستان کی روح نظر آتی ہے، گاؤں کی مٹی کی خوشبو نظموں کی فضا کو معطر کر دیتی ہے۔ انھیں یہاں کے ندی نالوں، پہاڑوں، جنگلوں، جھاڑیوں، ٹیلوں، ہرے بھرے کھیت کھلیانوں، درختوں، ان پر بسیرا کئے ہوئے پرندوں سے حد درجہ پیار تھا۔ ندا فاضلی کی گاؤں سے یہ وابستگی دراصل ان کے خون میں شامل تھی۔ ان کی یہ نظمیں لوگوں کے جذبات، احساسات، ان کی رسمیں، ان کے رہن سہن، ناؤ نوش کا خوبصورت البم ہیں۔ یہ البم ایسا ہے کہ جس میں ہندوستان کی تہذیب جلوہ گر ہے۔ گاؤں کی مٹی یا فضا سے ان کا یہ احساس نظیر کی یاد تازہ کرتا ہے۔ نظیر اکبرآبادی نے بھی اپنی نظموں میں گاؤں اور ہندوستانی مشترکہ تہذیب کی بہترین عکاسی کی ہے۔ دوسرے شعراء کے یہاں یہ جذبہ خال خال ہی نظر آتا ہے۔ حالانکہ اردو شاعری میں معنی آفرینی، ندرت خیال، جذبات کی تڑپ اور نغمگی موجود ہے مگر گاؤں سے وابستگی کا یہ جذبہ وہاں نظر نہیں آتا جو ندا فاضلی کے یہاں ملتا ہے۔ ندا فاضلی نے اپنی نظموں میں ہندوستان کے معمولی انسانوں کی چھوٹی چھوٹی باتوں اور ان کی ضرورتوں کو اپنے فکر و فن سے شاعری کا جامعہ پہنا کر معاشرے کے سامنے رکھا ہے۔ ندا فاضلی کا یہ طرز عمل صرف ہندوستان تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ یہ عالمی گاؤں (Global village) تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں خاندان، محلّہ، گاؤں، ریاست، وطن، سبھی شامل ہیں۔

تہذیبی امتزاج ایک سلسلہ ہوتا ہے اور یہ سماجی قوانین کے تابع ہوتا ہے اس تہذیبی امتزاج کے ردوبدل کی کوشش میں اگر بے ترتیبی سے کام لیا جائے تو یہ نظام بدل جاتا ہے۔ اس تہذیبی امتزاج کا سب سے زیادہ تجربہ ہمارے ملک ہندوستان کو ہے۔ ہندوستان میں ہزارہا برس سے مختلف قومیں، تہذیبیں، اور مختلف زبانیں بولنے والے اور مختلف مذاہب کے ماننے والے

آتے گئے انہی کے میل جول سے ہندوستانی تہذیب نے جنم لیا۔

ہندوستان میں گاؤں دیہات کی زندگی معاشی طور پر پرسکون، غیر متبدل، اور غیر ترقی پذیر ہے۔ لیکن ہمیں اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اس کے باوجود دیہی زندگی بے حد سادہ اور مستقل ہوتی ہے۔ ہندوستان کے دیہات میں ان لوگوں کی تعداد زیادہ ہے جو مشترک سماجی اور مذہبی روایات کو مانتے ہیں۔ وہاں اکثر فرصت کے وقت میں لوگ چوپالوں پر بیٹھتے ہیں اور عوامی گیتوں، قصوں، کہانیوں سے سب کا دل بہلاتے ہیں۔ گاؤں میں کسان متعدد سماجی گروہوں میں کھیتوں پر کام کر کے فصل اگاتا ہے۔ اور اسی فصل سے شہر اور گاؤں والوں کے کھانے کا انتظام ہوتا ہے اور دوسرے افراد اس میں ثانوی حیثیت سے شامل ہوتے ہیں۔ عورتیں بھی ان کاموں میں شریک ہوتی ہیں وہ گھر کے کاموں کے علاوہ اپنے خاوند کے ساتھ کھیتوں پر بھی کام کرتی ہیں۔ سبھی لوگ ایک دوسرے کی خوشی وغم میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ حقیقت میں اگر دیکھا جائے تو گاؤں ہی سماجی ترقی میں معاون ثابت ہوتے ہیں اور دیش کی معاشی حالت کو سدھارنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

انھوں نے اپنی ایک نثری کتاب ''دنیا میرے آگے'' میں ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اکثر بمبئی میں ندا فاضلی شام کو ساحر لدھیانوی کے گھر چلے جایا کرتے تھے اس وقت ساحر فلمی دنیا پر چھائے ہوئے تھے۔ ندا فاضلی کا ان دنوں روزی روٹی اور رہنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ ساحر لدھیانوی کے گھر اچھا کھانا اور شراب بھی مل جاتی تھی۔ ایک روز ندا فاضلی نے شراب کے نشے میں ترقی پسندی کے پس منظر میں ساحر کی شاعری کو کمتر اور فیض و فراق کی شاعری کو زیادہ اہم کہہ دیا۔ پھر کیا تھا ساحر کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔ انھوں نے ندا فاضلی کو کھانے سے بھی اٹھا دیا اور بہت برا بھلا کہا۔ جب ندا فاضلی ساحر کے گھر سے جانے لگے تو ساحر نے روکنے کی کوشش بھی کی مگر ندا فاضلی نہیں رکے اور دیر رات ساحر کے گھر سے باہر آ گئے۔ وہ رات انھوں نے ایک بینچ پر گزاری اور اسی بینچ پر ایک نظم بعنوان ''بمبئی'' لکھی۔ اس نظم میں ان کا درد صاف طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس نظم میں انھوں نے اپنے درد و غم کا اظہار بھی کیا ہے اور شہر بمبئی کی تصویر

کشی بھی کی ہے۔ نظم پیش ہے:

یہ کیسی بستی ہے میں کس طرف چلا آیا
فضا میں گونج رہی ہیں ہزاروں آوازیں
سلگ رہی ہیں ہواؤں میں ان گنت سانسیں
جدھر بھی دیکھو
کھوے، کولہے، پنڈلیاں، ٹانگیں
مگر کہیں کوئی چہرہ نظر نہیں آتا

نظم اپنے اختتام کو اس طرح پہنچتی ہے۔

یہ قبر قبر جزیرہ کسے جگاؤ گے
خود اپنے آپ سے الجھو گے ٹوٹ جاؤ گے
یہاں تو کوئی بھی چہرہ نظر نہیں آتا

ندا فاضلی کی اسی نظم میں بے چارگی کی کیفیت کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہاں آدمی کا وجود تو محسوس کیا جاسکتا ہے لیکن دھندلا دھندلا۔ اسی دھندلے وجود نے نظم میں ایک طنز پیدا کردیا ہے۔ ''ہزاروں آوازیں''، ''سانسوں کا سلگنا'' کھوے، کولہے، پنڈلیاں اور ٹانگوں نے نظم میں کسی کی موجودگی کا احساس کرب کی شدت کے ساتھ کرایا ہے۔ احساس کے پیرائے میں یہ نظم کرب کے ساتھ سنجیدہ مسئلے کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔ اس نظم میں شہر بمبئی کی بھاگتی دوڑتی زندگی اور روزمرہ کی جدوجہد کو انھوں نے بڑے ہی فنکارانہ انداز سے پیش کیا ہے۔ اسی احساس کو محمد علوی نے اپنی نظم ''مجھے ان جزیروں میں لے جاؤ'' میں اس طرح پیش کیا ہے:

مجھے ان جزیروں میں لے جاؤ
جو کانچ جیسے
چمکتے ہوئے پانیوں میں گھرے ہیں
تو ممکن ہے میں

اور کچھ روز جی لوں

کہ شہروں میں اب

میرا دم گھٹ گیا ہے

طوالت کے خوف سے نظم کا ایک ہی حصہ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں انھوں نے شہر کی زندگی سے اکتا جانے اور اسے چھوڑ کر کسی جگہ منتقل ہو جانے کا ذکر کیا ہے جہاں کا ماحول پرسکون ہو اور صاف آب و ہوا ہو۔ وہ شہر کی اس بھاگتی دوڑتی زندگی سے پریشان ہیں اور جھلاہٹ میں اسے چھوڑ جانے کی بات کرتے ہیں۔ جہاں ندا فاضلی نے بھی اپنی نظم میں شہر کی بھاگتی دوڑتی زندگی کو اپنے انداز میں نظم کیا ہے وہیں محمد علوی نے اس میں جھلاہٹ کے ساتھ اس سے الگ ہونے کی بات کہی ہے۔

محمد علوی کی نظم کے آخری حصہ میں انسانی معاشرے کا انتشار اور اس کی زندگی کے دکھ درد کا اظہار ہے۔ اس دکھ درد سے صرف انسانی معاشرہ یا زندگی ہی دوچار نہیں ہے بلکہ جانور اور پرندے بھی اس جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ Urbanisation کی وجہ سے فطرت کے منظر سمٹتے جا رہے ہیں۔ چاروں طرف پیڑ پودوں کو کاٹ کر اونچی اونچی عمارتیں بن رہی ہیں۔ جانوروں اور پرندوں کو رہنے کے لیے آبادی چھوڑنے سے انسانی زندگی کا ان کے ساتھ تال میل ختم ہوتا جا رہا ہے اور فضا میں ایک عجب طرح کا زہر گھلتا جا رہا ہے۔ جس سے انسان کا سانس لینا دوبھر ہو رہا ہے۔ اسی زہر سے چھٹکارے کی چاہت کا اظہار محمد علوی نے اپنی اس نظم میں کیا ہے اور فضائی آلودگی کا مسئلہ پیش کر کے ایک مرتبہ پھر انسان کو اس طرف متوجہ کیا ہے۔ اسی مسئلے کو زبیر رضوی نے اپنی نظم ''گم ہوتا شہر'' میں اس طرح پیش کیا ہے۔

بدلتا، پھیلتا، بڑھتا ہوا یہ شہر

پہچانا نہیں جاتا

وہ اس کے چوک، چوراہے

فصیلیں اور دروازے

گلی کوچے

وہ سارے آشنا چہرے

جو میری یاد کا حصہ تھے

اب سب حافظے میں

منہدم ہونے لگا ہے

شہر میں جو کچھ تھا میرا

وہ سب ہی مٹنے لگا ہے

شہر سارا اجنبی ہونے لگا ہے

ندا فاضلی کی ایک نظم ''سنسار'' ملاحظہ ہو جس میں انھوں نے اسی منظر کو کتنے خوبصورت اور آسان اسلوب میں کہا ہے۔

پھیلتی دھرتی

کھلا آکاش تھا

میں۔

چاند، سورج، کہکشاں، کہسار، بادل

لہلہاتی وادیاں، سنسان جنگل

میں ہی میں

پھیلا ہوا تھا ہر دشا میں

جیسے جیسے

آگے بڑھتا جا رہا ہوں

ٹوٹتا، مڑتا، سکڑتا جا رہا ہوں

کل

زمیں سے آسماں تک میں ہی میں تھا

آج

اک چھوٹا سا کمرہ بن گیا ہوں۔

ندا فاضلی کی اس نظم میں وہ سارا منظر ہے جو محمد علوی اور زبیر رضوی کی مذکورہ بالا نظموں میں ملتا ہے لیکن ندا فاضلی نے اس منظر کو دونوں سے مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔ سیدھی بات کو آسان الفاظ میں بیان کر کے اس میں گیرائی اور گہرائی پیدا کرنا ہی انھیں اپنے معاصرین میں منفرد بناتا ہے۔ ندا فاضلی کی اس طرح کی نظم میں جھلاہٹ نہیں ہے بلکہ انھوں نے اس کے بیان میں متوازن لہجہ اپنایا ہے۔

شہروں میں آبادیاں بڑھ رہی ہیں اور زمینوں پر مکانات کارخانے وغیرہ تعمیر ہو رہے ہیں یہاں تک کہ یہ سلسلہ قبرستانوں تک بھی پہنچ چکا ہے اور ایک ایک قبر میں کئی کئی مردے دفن ہو رہے ہیں۔ زمین کی اسی تنگی کو محمد علوی نے اپنی ایک نظم ''کتبہ'' میں اسطرح پیش کیا ہے۔

قبر میں اترتے ہی
میں آرام سے دراز ہو گیا
اور سوچا
یہاں مجھے
کوئی خلل نہیں پہنچائے گا
دو گز زمین
میری
اور صرف میری ملکیت ہے
اور میں مزے سے
مٹی میں گھلتا ملتا رہا
وقت کا احساس
یہاں آکر ختم ہو گیا
میں مطمئن تھا
لیکن بہت جلد

یہ اطمینان بھی مجھ سے چھین لیا گیا

ہوا یوں
کہ ابھی میں
پوری طرح مٹی بھی نہ ہوا تھا
کہ ایک اور شخص
میری قبر میں گھس آیا

اور اب
میری قبر پر
کسی اور کا
کتبہ نصب ہے!!

یہی وہ ذہنی انتشار ہے جس سے ندا فاضلی بھی دوچار ہوئے۔ انھوں نے اسے اپنی نظموں میں (جن کا ذکر پچھلے صفحات میں ہو چکا ہے) پیش کیا ہے۔ یہ انتشار ندا کے یہاں تو زندگی ختم ہونے کے ساتھ ساتھ ختم ہو جاتا ہے لیکن محمد علوی کے یہاں یہ انتشار مرنے کے بعد بھی باقی رہتا ہے اور قبر میں اس کا پیچھا کرتا ہوا پہنچ جاتا ہے۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ شہروں کے قبرستان میں مردوں کے لیے قبریں کچھ ہی روز تک ان کی قبریں رہتی ہیں بعد میں ان قبروں میں دوسرے مردے دفنا دیے جاتے ہیں اور پہلے مردے کے نام کے کتبے کی جگہ دوسرے مردے کے نام کا کتبہ لگا دیا جاتا ہے۔

☆☆☆

جتنی بری کہی جاتی ہے اتنی بری نہیں ہے دنیا
بچوں کے اسکول میں شاید تم سے ملی نہیں ہے دنیا

(ندا فاضلی)

ندا فاضلی کی نظموں میں عشق اور رومان

ندا فاضلی کی نظموں میں ان کے ذاتی تجربے موجود ہیں۔ انھوں نے اردو کے علاوہ انگریزی اور ہندی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے عشق و رومان کا منظر ان کے یہاں جس پیکر میں ڈھلا ہوا ملتا ہے وہ ان کی وسعت مطالعہ کا ہی نتیجہ ہے اور ساتھ ہی ان کے فطرت سے لگاؤ اور اپنوں سے لگاؤ کا عکس بھی نظر آتا ہے۔

انھوں نے اپنی نظموں میں جو عشقیہ مضامین سمیٹے ہیں وہ غم اور نشاط کی ہم آہنگی سے ایک نئی دنیا کی تعمیر کرتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی سے بیزار نہیں تھے اور نہ ہی انھوں نے فرار کی تلقین کی۔ اس کے برعکس انھوں نے زندگی کے حسن کو مختلف زاویوں سے دیکھا اور پرکھا، ان کی عشقیہ نظموں میں عشق کی دوسری کائنات بسی ہوئی ہے۔ محبوب کے حسن کو مختلف زاویوں سے دیکھ کر اور پرکھ کر اسے محدود نہ رکھا بلکہ اسے دنیا سے متعارف بھی کرایا۔ اور اس میں کائنات کے مختلف رنگوں کی آمیزش سے عشق کو بیان کیا۔ اردو شعراء کے یہاں عشق کی عام طور سے دو کیفیتیں ہوتی ہیں۔ ظاہری اور باطنی۔ کسی نے حسن و عشق کی تلاش ظاہر میں کی اور کسی نے باطن میں۔ لیکن ایسے بہت ہی کم شعراء ہیں جنھوں نے اس عشق کی تلاش دونوں یعنی ظاہری اور باطنی طور پر کی۔ ندا فاضلی نے اپنی عشقیہ نظموں میں ظاہری اور باطنی دونوں کیفیتوں کا اظہار کیا ہے۔

ان کا تصور عشق صرف گوشت پوست تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ عشق زمین کی وسعت میں بھی پھیلا ہوا ہے۔ زمین پر جتنی بھی چیزیں ہیں ان سے ان کا رشتہ ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کی نظمیں خوشی اور اطمینان عطا کرتی ہیں۔ انھوں نے خود کے تعمیر کردہ شعری افکار سے نظم کی نغمگی کو فطرت کے نور سے منور کر کے الفاظ کے قالب میں ڈھال کر نظم بنایا ہے۔ ان کے اس اسلوب میں شوخی، سادگی اور محبت ہے۔ ندا فاضلی نے بنیادی طور پر حسن کا بیان اس فنکاری سے کیا ہے کہ اس میں ہندوستانی تہذیب کی جھلک صاف طور پر نظر آتی ہے۔ ان کی آواز میں ہندوستانی فضا، ہندوستانی تہذیب، ہندی الفاظ اور ان سے پیدا شیرینی موجود ہے۔ ندا کی رومانی نظمیں پڑھ کر جنسی جذبہ نہیں ابھرتا بلکہ ذہن میں شائستگی اور پاکیزگی ابھرتی ہے۔ اس قبیل کی نظموں میں دلچسپی کے علاوہ ایک یہ بھی خاصیت ہے کہ یہ نظمیں دلکش اور فرحت بخش بھی ہیں۔ اس طرح کی نظموں میں ''وقت سے پہلے''، ''ایک خط''، ''شکایت''، ''بے خبری''، ''فاصلہ''، ''دیوانگی باقی رہے''، ''انتظار''، ''سمجھوتا''، ''ایک مسکراہٹ''، ''چھوٹی سی ہنسی'' اہم ہیں۔ ان نظموں کے علاوہ اور بھی نظمیں ہیں جن میں انھوں نے حسن و عشق اور رومان کو پیش کیا ہے۔

رومان کی مثال کے لیے ان کی نظم ''ایک مسکراہٹ'' پیش ہے۔ جس میں رومانیت الفاظ کے پیکر میں ڈھل کر انہیں دوسرے شعراء سے ممیز کرتی ہے۔ نظم ملاحظہ ہو:

چمکتے بتیس موتیوں والی مسکراہٹ
کھلا ہوا بادبان جیسے
ڈھلا ہوا آسمان جیسے
سحر کی پہلی اذان جیسے
پتہ نہیں نام کیا ہے اس کا
خبر نہیں کام کیا ہے اس کا
وہ ٹھیک چھ بج کے پانچ منٹ کی ایک جگمگاہٹ
اتر کے ہونٹوں سے

یوں مرے ساتھ چل رہی ہے
نہ چھاؤں کچھ کم ہے راستوں سے
نہ دھوپ زیادہ نکل رہی ہے
میں جس طرح سوچتا تھا
بستی اسی طرح سے بدل رہی ہے
یہ ایک ستارہ
جو میری آنکھوں میں دیر سے جگمگا رہا ہے
اسے سمندر بلا رہا ہے

اس نظم میں رومانیت ایک الگ نہج پر ہے۔ کسی لڑکی کی کہانی جو شاید ندا سے انسیت رکھتی تھی اس کا آنا جانا ہنسی یہ سب انھوں نے اس نظم میں اس طرح پیش کیا ہے کہ یہ رومانیت حد سے تجاوز نہیں کرتی۔

اردو، ہندی، انگریزی غرضیکہ تمام زبانوں کی شاعری میں عورت ہی کو پیار اور محبت کی علامت بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ عشق و محبت عورت کی سرشت میں شامل ہے۔ عورت کی تخلیق کو ہی دنیا کی سب سے بہترین تخلیق مانا گیا ہے۔ وہ عورت ہی ہے جو بچے کو نو مہینے تک اپنے رحم میں حفاظت کر کے اسے اپنا خون جگر پلا کے اسے ایک وجود بخشتی ہے اور اس کے پیدا ہونے کے بعد اس کی حفاظت اور دیکھ بھال کرتی ہے۔ اچھے برے کی تمیز سکھاتی ہے۔ زندگی کے آداب سے آگاہ کرتی ہے اور باقاعدہ مدرسے کے لیے اسے تیار کرتی ہے۔ عورت سے اس عشق کو کسی نے کسی زاویے سے دیکھا ہے اور کسی نے کسی زوایے سے۔ ندا فاضلی نے عشق کو جس زاویہ نگاہ سے دیکھا ہے ایسا ہر شاعر نہیں دیکھتا اور شاید یہی وجہ رہی ہوگی جوان کے مضامین میں پھیلاؤ نہیں ملتا۔ بقول پروفیسر کوثر مظہری:

”اگر بغور دیکھا جائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ندا نے عشقیہ مضامین کو زیادہ وسعت نہیں دی ہے۔ چونکہ انہوں نے

زندگی کے تلخ تجربے اور مشاہدے سمیٹے ہیں۔ان کے گلے گلے دکھوں اور جدو جہد کا پانی آیا ہے لہٰذا زمانے کے اندر اتر کر ان کی تخلیقی حسیت نے انہیں ایک ایسے شاعر کے روپ میں ابھارا ہے جو اپنے ہمعصروں میں مضامین اور اسالیب اظہار دونون سطحوں پر الگ نظر رکھتا ہے۔'' (اردو دنیا دسمبر ۲۰۱۶ص ۶۷)

پروفیسر کوثر مظہری کے اس قول کی روشنی میں اگر ہم ندا فاضلی کی عشقیہ شاعری کا جائزہ لیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ انہوں نے جس عشق کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے وہ پاکیزگی کے ساتھ غم و نشاط کی آمیزش پر مبنی ہے۔

جنس پرستی کی محبت میں عاشق اپنے معشوق کو اپنے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے مفاد کے لیے اسے استعمال میں لاتا ہے۔ اس کے جسم سے اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے وہ مسلسل جدو جہد میں لگا رہتا ہے اور صرف جنسی عمل کی طرف راغب کرتا ہے۔ جب کہ اصل عشق اور پیار تو وہ ہے جو اپنے معشوق اور محبوب کو کسی طرح کی کوئی تکلیف یا کسی طرح کا کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے۔اس جذبے میں عاشق و معشوق کے درمیان جو رشتہ ہوتا ہے وہ صرف جسمانی دوریوں کو عبور کرنے اور اپنی خواہشات نفسانی کی تکمیل کے لئے ہوتا ہے۔

یقیناً محبت زندگی کا مدعا ہے اور اسے اسی وقت پورا کیا جا سکتا ہے جب انسان اپنی ذات کو پہچانے۔اگر ایسا نہیں ہوتا ہے تو محبت میں ضرور کچھ خرابی ہے اور محبت اپنی تکمیل میں ادھوری ہے۔ بس ضروری ہے کہ پہلے انسان خود کو پہچانے۔ جب تک انسان خود شناشی کے عمل سے انجان یا بے فکر رہے گا تب تک وہ زمانے کی گردش سے دو چار رہے گا۔اسے کسی بھی طرح کے باہری جبر و استحصال یا کسی دباؤ سے آزاد ہونا پڑے گا۔ اگر انسان کے اندر غلامی، ناچاری، بے عملی ہو تو وہ کبھی اس کے راز سے آشنا نہیں ہو سکتا۔

بہت سے شعراء نے جنس زدگی کی شاعری میں اس احساس کو عریاں کر کے پیش کیا ہے۔لیکن ندا فاضلی کی نظموں میں یہ احساس اور جذبہ اپنی حدوں سے متجاوز نہیں ہوتا اور فحاشی کے دائرے میں داخل نہیں ہوتا۔ ُن کی نظم ''چھوٹی سی ہنسی'' میں اس احساس وجذبے کو اپنی حدوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

سونی سونی تھی فضا
میں نے یوں ہی
اس کے بالوں میں گندھی خاموشیوں کو چھولیا
وہ مڑی
تھوڑا ہنسی
میں بھی ہنسا
پھر ہمارے ساتھ
ندیاں، وادیاں
کہسار، بادل
پھول، کونپل
شہر، جنگل
سب کے سب ہنسنے لگے
اک محلے میں
کسی گھر کے
کسی کونے کی
چھوٹی سی ہنسی نے
دور تک پھیلی ہوئی دنیا کو
روشن کر دیا ہے
زندگی میں

زندگی کا رنگ پھر سے بھر دیا ہے

یہ نظم رومانیت سے لبریز ہے اور واحد متکلم کے انداز میں آگے بڑھتی ہے۔ ندا ایک وقت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ فضا خوشگوار اور سونی تھی اور اسی کے اثر میں ڈوب کر میں نے اس کے بالوں کو چھوا، اس کا اثر اس پر ہوا اور وہ میرے بال چھونے پر مڑی، پھر ہنسی، اور اتنا ہی نہیں اس کے اور میرے ساتھ وہاں موجود ندیاں، وادیاں، پھول، کہسار، بادل، شہر، جنگل سبھی ہنسنے لگے۔ اور چاروں طرف خوشی کی روشنی جگمگانے لگی۔ ایسا لگا جیسے سونی پڑی اس دنیا میں پھر سے بہار آ گئی۔ زندگی جو بے رنگ ہو گئی تھی اس مسکراہٹ نے اس میں زندگی کا رنگ بھر دیا ہے۔ اس رومانی نظم میں بھی انھوں نے گاؤں کی فضا کو اپنی جولانیٔ طبع سے رومانیت کا لباس پہنا کر ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی رومانی نظمیں پاکیزگی کا احساس دلاتی ہیں۔

اس سلسلے کی اور بھی نظمیں ہیں جن میں ''دو کھڑکیاں''، ''ایک لڑکی''، ''پیا نہیں جب گاؤں میں''، ''ساجن جنگل پار گئے''، ''ایک ملاقات''، ''ایک دن کی سیر''، ''دو سہیلیاں''، مشورہ''، ''پھر یوں ہوا'' اہم ہیں۔ ان سبھی نظموں میں رومانیت کی جھلک تو نظر آتی ہے لیکن کہیں بھی یہ رومانیت حد سے تجاوز کرتی نظر نہیں آتی۔ نظم ''دو سہیلیاں'' رومانیت سے لبریز ہے لیکن اپنی حدوں میں رہتے ہوئے۔ حالانکہ ان کی دوسری رومانی نظموں کے مقابلے میں اس میں رومانیت کا اثر زیادہ ہے۔ اس کا آخری حصہ پیش ہے:

ہنسی ہنسی میں ایک دوجے پر بدلی بن بن کریوں ٹوٹیں
آٹے جیسا کس کر گوندھیں
کئی جگہ سے ٹوٹیں پھوٹیں

اس پوری نظم میں دو سہیلیوں کا ذکر کیا گیا ہے جو بیٹھی ہوئی اُوب رہی ہیں۔ ان میں سے ایک سہیلی دوسری سے کہتی ہے، کب تک یونہی چپ چاپ بیٹھے رہیں گے آؤ ادھر ادھر دوڑ لگائیں یہاں تک کہ ہمارے سر کے بال بھی کھل جائیں اور گھر سے نکل کر باہر کا منظر دیکھیں۔ دونوں چل کر تالاب سے پانی بھر کر لائیں اور اسی دوران کچھ شرارتیں بھی

کریں۔ کبھی جھولیں کبھی ایک دوسرے پر پتھر پھینکیں۔ یہ ساری باتیں حقیقت میں اس عمر میں ہوتی ہیں جب شعور پختہ نہیں ہوتا۔ یہ دونوں سہیلیاں عمر کی اس منزل میں ہیں جب جسم کے اندر بہت سی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور یہ تبدیلیاں خیالات پر بھی اثر ڈالتی ہیں۔ دل پابند ہو کر نہیں رہنا چاہتا اور طبیعت جنسیت کی طرف مائل ہوتی ہے۔ یہ دونوں سہیلیاں اسی کیفیت سے گزر رہی ہیں اور اس تبدیلی سے پیدا ہونے والے جذبات پر قابو نہیں رکھ پا رہی ہیں۔ یہ وہ دور ہے جب ہلکا سا لمس بھی بدن میں تحیر پیدا کر دیتا ہے۔ اسی تحیر کی لذت سے لطف اندوز ہونے کے لیے وہ ہنسی ہنسی میں ایک دوسرے پر بدلی بن کر ٹوٹنے، آٹا جیسے گوندھنے اور جگہ جگہ سے ٹوٹنے پھوٹنے کی باتیں کرتی ہیں۔ نظم کے خیال کو جنس سے مستعار ضرور لیا گیا ہے لیکن اس میں نہ تو جنسی تلذذ کی کیفیت ہے اور نہ ہی ہوسناکی ہے۔ بلکہ اس میں ایک طرح کا لطیف جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔

مخمور سعیدی کے یہاں بھی رومانیت اسی نہج پر پہنچی نظر آتی ہے۔ اس سلسلے کی نظموں میں ''ایک لڑکی''۔ ''حسن نظارہ''۔ ''ایک تبسم ایک کرن'' اور ''سرِ راہ گزارے'' اہم ہیں۔ نظم ''سرراہ گزارے'' کا آخری حصہ ملاحظہ ہو:

اور اب ان آنکھوں کو آئیں سپنے کیسے کیسے
اب اس بھیڑ میں چلتے پھرتے یوں لگتا ہے جیسے
جنم جنم سے اس کا رستہ دیکھ رہا ہوں میں
وہ جلدی میں گذر گئی ہے، رکا کھڑا ہوں میں

ندا فاضلی کی نظم ''مشورہ'' میں بھی رومانیت کا عکس نظر آتا ہے۔ ''وہ لڑکی'' نظم میں انھوں نے اپنی اس محبت کا ذکر کیا ہے جو ان کے گاؤں میں پروان چڑھی اور وہیں ختم ہو گئی۔ نظم ملاحظہ ہو:

وہ لڑکی یاد آتی ہے
جو ہونٹوں سے نہیں پورے بدن سے بات کرتی تھی
سمٹتے وقت بھی چاروں دشاؤں میں بکھرتی تھی

وہ لڑکی یاد آتی ہے

وہ لڑکی اب نہ جانے کس کے بستر کی کرن ہوگی

ابھی تک پھول کی مانند ہوگی یا چمن ہوگی

نظم کے اس حصے میں انھوں نے اپنی محبوبہ کا ذکر کیا ہے۔ جب وہ اپنا گاؤں چھوڑ کر بمبئ آگئے تو یہاں انھیں اس کی محبت یاد آرہی ہے۔ شہر کی بھاگتی دوڑتی زندگی میں انھیں جب فرصت ملی تو اس کی یاد ستانے لگی اس کا سراپا انھوں نے صرف دو مصرعوں میں بیان کردیا ہے۔ جب وہ بات کرتی تھی تو ایسا لگتا تھا جیسے صرف ہونٹ ہی نہیں اس کا پورا بدن ہی بات کررہا ہو۔ اور جب وہ شرماتی تھی تو اپنے آپ کو سمیٹ لیتی تھی۔ یہاں انھوں نے تضاد پیدا کردیا ہے۔ یعنی جب وہ سمٹتی تھی تو ایسا لگتا جیسے وہ اپنے چاروں طرف بکھر رہی ہے۔ ''دشاؤں میں بکھرتی تھی'' کہہ کر ندا فاضلی نے نظم میں ایک ایسی کیفیت پیدا کردی ہے جو قاری کے دل پر سیدھا اثر ڈالتی ہے۔ آگے وہ اس کے بارے میں سوچتے ہیں کہ اب اتنا وقت ہوگیا اس لڑکی سے جدا ہوئے، نہ کوئی خبر ہے اور نہ ہی کبھی ملاقات ہوئی۔ اب نہ جانے وہ کیسی ہوگی۔ اس کی شادی ہوگئی ہوگی یا نہیں اس وقت تو انھوں نے خواب بنے تھے کہ ہم شادی کرکے اپنا گھر آباد کریں گے مگر اب وقت یہ ہے کہ وہ گاؤں میں ہے اور میں یہاں اس سے بہت دور شہر میں ہوں، نہ تو میں نے اس کی کوئی خیر خبر رکھی اور نہ کچھ خیال ہی رکھا۔ پتہ نہیں اس نے شادی کرلی ہوگی۔ اور اگر شادی کر بھی لی ہوگی تو نہ جانے کس سے کی ہوگی وہ رات کو کس کے پاس ہوگی۔ یہ ان کے احساس رومان کی طرف اشارہ ہے۔ وہ یہ بھی فکر کرتے ہیں کہ شادی کے بعد اس کے بچے بھی پیدا ہوگئے ہوں گے یا نہیں؟ کچھ پتہ نہیں۔ انھوں نے پھول اور چمن کے استعارے سے ایک خاص کیفیت پیدا کی ہے۔ کیونکہ پھول اکیلا ہوتا ہے اور جب یہی پھول اپنی بہاریں دکھا چکا ہوتا ہے تو پھر اس میں بیج پیدا ہوجاتے ہیں اور یہی بیج زمین میں بکھر کر دوسرے نئے پودے پیدا کرتے ہیں جن پر پھر نئے پھول کھلتے ہیں۔ اور اس طرح پورا چمن تشکیل پاتا ہے۔ نظم آگے بڑھتے ہوئے ان کی یادوں کو تروتازہ کرتی ہے۔

بجلی رات

اب بھی

جب بھی گھونگھٹ اٹھاتی ہے

لچکتی کہکشاں جب ہنستے ہنستے ٹوٹ جاتی ہے

کوئی البیلی خوشبو بال کھولے مسکراتی ہے

وہ لڑکی یاد آتی ہے

ندا فاضلی کی یہ نظم عشق کے جذبے سے مملو ہے اور ان کی جمالیاتی حس نے عشق کی کیفیت کو ''البیلی خوشبو'' سے متعارف کرایا ہے۔ اس میں عشق و محبت کی جزیات کو نئے لب و لہجے میں پیش کیا ہے۔ نظم میں وہ اپنے ماضی کی یادوں کا ذکر کرتے ہوئے ان راتوں کو یاد کرتے ہیں جب وہ ان سے ملتی تھی اور وہ اس کے بالوں کو اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے سلجھایا کرتے تھے۔ یہ سلجھانا تو ایک مہمل عمل تھا۔ اس کے ذریعے وہ اس کیفیت کو حاصل کرنا چاہتے تھے جس سے عشق میں گرمی پیدا ہو۔ اب جب بھی ایسی رات یا کوئی ایسی فضا ہوتی ہے تو انھیں یہ ساری باتیں یاد آنے لگتی ہیں۔ ان کے پیار میں رومانیت کی آمیزش میں شدت تو ضرور نظر آتی ہے لیکن انھوں نے اپنے کسی پیار کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچایا۔

ندا فاضلی نے عشق کے دائرے کو صرف اپنے محبوب تک ہی نہیں رکھا بلکہ اس دائرے میں ماں سے بھی عشق ہے، بہن سے بھی عشق ہے، چھوٹے چھوٹے بچوں سے بھی عشق ہے اور ان تمام چیزوں سے عشق ہے جن کا تعلق ان سے رہا ہے چاہے وہ گاؤں میں ہو یا شہر میں۔ ان کے یہاں عشق نئے نئے پیرائے میں ملتا ہے۔

بچوں سے عشق بھی ندا فاضلی کی نظموں میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ انھوں نے عشق کے دائرے کو اتنی وسعت عطا کی ہے کہ یہ محبوب تک محدود نہ رہ کر کائنات کے وسیع منظرنامے پر پھیل گیا ہے۔ جس میں گھر کے افراد، گاؤں شہر کے لوگ اور بہت سی بے جان چیزیں بھی شامل ہو گئی ہیں۔ انھوں نے اپنی بیٹی تحریر فاطمہ کے لیے بھی نظمیں لکھی ہیں۔ جن میں ''جسے لکھتا ہے سورج''، ''مرمت کی ضرورت''۔ اور ''چھوٹی سی شاپنگ'' خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان

میں آخرالذکر نظم ''چھوٹی سی شاپنگ'' پیش ہے۔

گوٹے والی

لال اوڑھنی

اس پر

چولی گھاگرا

اس سے میچنگ کرنے والا

چھوٹا سا اک ناگرا

اپنی بیٹی تحریر فاطمہ کو لے کر وہ جے پور میں شاپنگ کے لیے نکلے ہیں۔ چاروں طرف طرح طرح کے کھلونے اور دیگر اشیاء فروخت ہونے کے لیے رکھے ہوئے ہیں۔ لیکن ان کی بیٹی تحریر فاطمہ نے ساری چیزیں نہ خرید کر اپنے لیے صرف، یعنی اپنی گڑیا کے لیے ایک چھوٹی سی لال اوڑھنی خریدی ہے جس پر گوٹا لگا ہوا ہے۔ اور ایک چولی گھاگرا خریدا ہے جو اس سے میچنگ کیے ہوئے ہے۔ یعنی اس نے صرف اپنے کھیلنے کے لیے ہی چند چیزیں خریدی ہیں۔ نظم اس طرح آگے بڑھتی ہے:

چھوٹی سی!

یہ شاپنگ تھی

یا!

کوئی جادو ٹونا

لمبا چوڑا شہر اچانک

بن کر

ایک کھلونا

اتہاسوں کا جال توڑ کے

داڑھی

پگڑی

اونٹ چھوڑ کے

الف سے

اماں

بے سے

بابا

بیٹھا باج رہا تھا

پانچ سال کی بچی

بن کر جے پور

ناچ رہا تھا

اس مختصر خریداری کے بعد ندا کو احساس ہوا کہ ان کی بیٹی تحریر فاطمہ نے تو کچھ خریدا ہی نہیں اپنے لیے صرف چند چیزیں یہ کوئی جادو تو نہیں اتنے بڑے شہر میں اس کو (تحریر) کو صرف یہ ہی چند چیزیں ملیں۔ یعنی ایسا لگا جیسے پورا شہر (جے پور) صرف ایک کھلونے میں سمٹ آیا ہو۔ جے پور کی جو پہچان ہے بڑی سی پگڑی، داڑھی اور اونٹ ان سب چیزوں پر ان کی بیٹی کی نظر نہیں گئی جبکہ جے پور میں جو بھی گھومنے جاتا ہے تو وہ یہاں سے ان چیزوں کی خریداری ضرور کرتا ہے اور اونٹ کی سواری بھی ضرور کرتا ہے۔ لیکن ان کی بیٹی نے ان سب باتوں کے برعکس کیا۔

ندا فاضلی کی نظروں میں اس شاپنگ کے بعد پورا جے پور صرف اپنی بیٹی کی خریداری میں سمٹ گیا اور اب انھیں پورا جے پور اپنی پانچ سالہ بیٹی تحریر کے ارد گرد ہی نظر آرہا ہے اس پوری نظم میں اپنی بیٹی کے لیے عشق دل کی گہرائیوں میں اترتا نظر آرہا ہے۔ ندا کا یہ عشق معصوم ہے۔ اسی عشق میں انھیں جے پور ناچتا ہوا نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنی تین نظمیں اپنی بیٹی تحریر کے نام کر کے اس سے عشق اور لگاؤ کا ثبوت دیا۔

نظم ''جسے لکھتا ہے سورج'' میں انھوں نے اپنی بیٹی کی حرکتوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ جیسے ہی

ان کے کمرے میں آئی اس نے ان کی طرف مسکرا کے دیکھا۔ بچوں کے لیے نظمیں، گیت، غزلیں، دوہے کوئی معنی نہیں رکھتے ان کے لیے تو صرف اپنے کھیلنے کے لیے کھلونے چاہئیں، خواہ وہ ٹوٹے ہوئے ہی کیوں نہ ہوں۔ وہ ان سے ہی خوش ہو کر دن بھر کھیلتے رہتے ہیں۔ دنیا کی تمام خوشیاں بچوں کو اپنے چھوٹے چھوٹے کھلونوں میں مل جاتی ہیں۔ بچوں کے ان احساسات وجذبات کو ندا فاضلی نے اپنی اس نظم میں پیش کیا ہے۔ جب ان کی بیٹی نے کمرے میں آ کر ندا کی ان سنجیدہ باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیا تو ندا فاضلی بھی اسی کی باتوں میں گھل مل گئے اور اسی کے ساتھ اس کے کھیل میں شامل ہو گئے۔ وہ کھیلتے کھیلتے طرح طرح کی باتیں کر رہی ہے جو ان کے لیے بے معنی ہیں اور وہ ان کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہیں لیکن ندا فاضلی اس کی ان باتوں میں شامل ہو جاتے ہیں جنھیں صرف سورج لکھتا ہے دریا پڑھتا ہے اور یہ سبزہ سنتا ہے اور یہ جو ہماری دھرتی ہے یہ ان باتوں کو سمجھ جاتی ہے۔ دراصل بچوں کا رشتہ فطرت سے گہرا ہوتا ہے وہ اپنے کھیل کھیل میں بے جان چیزوں سے گفتگو بھی کرتے رہتے ہیں اور انھیں اپنی باتوں کا جواب بھی ان بے جان چیزوں سے بغیر آواز وحرکت کے مل جاتا ہے۔ یہ سلسلہ نیا نہیں ہے بلکہ یہ تو صدیوں سے جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔

دنیا بری ہے، لوگ یہی سمجھتے ہیں، لیکن ندا فاضلی کی نظر میں دنیا اتنی بری نہیں ہے بشرطیکہ دنیا کو بچوں کی نظر سے دیکھا جائے۔ بچے ہمیشہ دنیا سے محبت کی باتیں ہی کرتے ہیں۔ وہ کبھی دنیا کو نقصان پہنچانے کی بات نہیں کرتے اور نہ سوچتے ہیں۔ ان کی سوچ معصوم ہوتی ہے۔ وہ اپنی ذات سے کسی کو نقصان پہنچانے کی سکت نہیں رکھتے۔ ندا فاضلی نے دنیا کو ہمیشہ بچوں کی نظر سے ہی دیکھا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے نظریے میں کشادگی ملتی ہے۔ اس کشادگی کو جاننے کے لیے ان کا یہ شعر کافی معاون ثابت ہوگا۔

جتنی بری کہی جاتی ہے اتنی بری نہیں ہے دنیا
بچوں کے اسکول میں شاید تم سے ملی نہیں ہے دنیا

بچے اسکول میں ایک دوسرے کے ساتھ اس میل جول اور پیار محبت کے ساتھ رہتے

ہیں کہ ان کے نزدیک ذات پات اور مذہب کوئی معنی نہیں رکھتے۔ ان کے نزدیک پورا اسکول ایک خاندان کی طرح ہے سب سے میل جول رکھنا اور وہ بھی بغیر کسی تاثر کے، یہی بچوں کی معصومیت ہوتی ہے۔ اگر انسان تمام دنیا کو بچوں کی نظر سے دیکھے تو اسے بہت اچھی اور بھلی نظر آئے گی۔ یہ اسے مذہب اور ذات کے نام پر ہونے والے فسادات وغیرہ سے کوسوں دور کردے گی اور تمام دنیا میں امن وامان کا ماحول بن جائے گا۔ آج کے دور میں اس طرح کے فکر اور نظریے کی خاصی ضرورت ہے جبکہ تمام دنیا میں ذات اور مذہب کے نام پر، ایک خونی ماحول بنا ہوا ہے۔ ندا فاضلی نے بچوں کے ساتھ اپنا رشتہ استوار رکھا اور ان سے جو کچھ انھوں نے اخذ کیا اسے اپنی نظموں میں پیش کیا۔

ندا کے عشق کا یہ عالم ہے کہ وہ پیڑ، پودوں، چرند پرند کو اپنا خاندان تصور کرتے ہیں۔ ایک جگہ انھوں نے اس کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ ان کی بے چینی صاف طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔

آنگن میں پیڑ ہیں نہ پرندے ہیں آس پاس
تقسیم ہوگیا ہے مرا خاندان کیا؟

جب وہ گاؤں میں تھے تو ان کے آنگن میں املی اور اسی کے سامنے پیپل کا پیڑ تھا جس کے نیچے وہ کھیلا کرتے تھے اور املی کے نیچے وہ کتارے اکٹھے کرکے انھیں اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر کھاتے تھے۔ بچپن کا یہ رشتہ ان کے رگ وپے میں اس طرح سما گیا تھا کہ یہ ان کی زندگی کا اٹوٹ حصہ بن گیا تھا۔ پیڑ پودوں کو انھوں نے اپنا خاندان قرار دیا ہے، یہ سب ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اس کا اظہار انھوں نے اپنی ایک نظم ''مجھے یاد ہے'' میں کیا ہے۔ نظم ملاحظہ ہو:

مجھے یاد ہے
میری بستی کے سب پیڑ

پربت
ہوائیں
پرندے

مرے ساتھ روتے تھے ہنستے تھے

میرے ہی غم میں

دریا!

کناروں پر سر کو پٹکتے تھے

میری ہی خوشیوں میں

پھولوں پہ

شبنم کے موتی چمکتے تھے

یقینی طور پر ندا نے نظم کے اس حصے میں اپنے گاؤں کا ذکر کیا ہے۔ وہ گاؤں کے درختوں ہواؤں، پرندوں، دریا سے اپنے تعلق کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مجھے اب بھی یاد ہے کہ میرے گاؤں کے سب پیڑ پودے، ہوائیں، پرندے، میرے ہی ساتھ روتے ہنستے تھے یعنی یہ سب ان کے غم میں غمگین اور خوشی میں خوش ہوتے تھے۔ دریا بھی اپنے سر کو کناروں سے پٹکتا تھا۔ دریا کا کناروں سے سر پٹکنا غم اور بے چینی کی پہچان ہے۔ اسے بہت سے شعراء نے برتا ہے لیکن جس حسن کے ساتھ میر انیسؔ نے اسے برتا ہے اس کی مثال اور کہیں نظر نہیں آتی۔ میر انیس کے مرثیے کی بیت ملاحظہ کیجئے:

پیاسی جو تھی سپاہ خدا تین رات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

جب خوشیوں کا موقع ہوتا تھا تو ندا کے ساتھ پھول بھی خوش ہوتے تھے گاؤں کی ان چیزوں سے ندا کا رشتہ انسانوں جیسا ہے جو غم اور خوشی کے احساس کو محسوس کرتے ہیں۔ نظم اس طرح اختتام کو پہنچتی ہے:

یہیں!

سات تاروں کے جھرمٹ میں

لاشکل سی

جو خنک روشنی تھی

وہی!
جو گنوؤں کی
چراغوں کی
بلّی کی آنکھوں کی
تابندگی تھی
ندی!
میرے اندر سے ہو کے گذرتی تھی
آکاش
آنکھوں کا دھوکا نہیں تھا
یہ بات ان دنوں کی ہے
جب اس زمیں کو
عبادت گھروں کی ضرورت نہیں تھی
مجھی میں خدا تھا

تاروں کی روشنی میں جو خنکی تھی۔ جگنوؤں کی روشنی میں، چراغوں کی روشنی میں اور اس چمک میں جو رات کے اندھیرے میں بلی کی آنکھوں میں ہوتی ہے، ندا کو اس سے تعلق محسوس ہوتا ہے۔ ان سب کا تعلق ندا سے گہرا تھا اور وہ اپنے گاؤں سے زمینی طور پر جڑے ہوئے تھے۔ وہ ندی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں ندی ان کے اندر سے گزرتی تھی اور آکاش (آسمان) جو کہ بہت دور ہے وہ بھی اتنا قریب لگتا تھا۔ اکثر ہم آکاش (آسمان) کو دیکھتے ہیں تو وہ صرف دھوکا ہی نظر آتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بادل ہمیں دور تک زمین سے ملتا نظر آتا ہے لیکن یہ صرف ایک التباس ہوتا ہے۔ اسی التباس کو ندا فاضلی نے اس نظم میں دھوکا نہ کہہ کر سچ بتایا ہے۔ یہ ان کے گہرے سماجی شعور اور فطرت سے تعلق کا نتیجہ ہے۔ اس سب کے مدنظر وہ اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ یہ سب لگاؤ اس وقت تھا جب خدا بنٹا ہوا نہیں تھا۔ انہوں نے خدا کا جلوہ دنیا کی ہر ایک شے میں اور ہر ذرے میں پایا۔ خدا ہر کسی کے گھر میں بستا تھا ایسا نہیں ہے کہ آج خدا

سب کے گھروں میں نہیں۔ آج بھی ہے کل بھی تھا اور ہمیشہ رہے گا۔ لیکن ضرورت ہے اس کو پہچاننے کی۔ اگر انسان اسے محسوس کرے تو خدا ہر وقت وہیں موجود محسوس ہوگا۔ ہر انسان میں خدا موجود ہے۔ ندا فاضلی نے اسی طرف اشارہ کر کے اپنے صوفیانہ فکر و نظر کو پیش کیا ہے اور یہاں پر بھی خسرو، کبیر کی روایت کا پاس رکھا ہے۔ آج کے اس دور میں جبکہ انسان نے خدا کے قیام کو مخصوص کر کے مندر، مسجد، گرجا، گردوارہ وغیرہ میں قید کر دیا ہے اور وقتاً فوقتاً اس کی عبادت کے لیے وہاں حاضر ہو کر خدا، بھگوان، ایشور یا جسکا جو بھی عقیدہ ہے، اس سے اپنا لگاؤ ظاہر کرتا ہے۔

صوفیانہ تصور ان کی دیگر نظموں میں بھی نظر آتا ہے اور وہ اسی انداز سے ہے کہ خدا کو ہر شے میں دیکھا جائے۔ انہوں نے خدا کو مخصوص کر کے نہیں رکھا۔ بچوں کے کھیل میں، ان کی باتوں میں، پرندوں کی چہچہاہٹ میں، درختوں میں حتیٰ کہ ہر شے میں انھیں خدا نظر آتا ہے۔ اپنی ماں سے عشق کو وہ اپنی نظم میں کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں:

بیسن کی سوندھی روٹی پہ کھٹی چٹنی جیسی ماں
یاد آتی ہے! چوکا باسن چمٹا پھکنی جیسی ماں
بانس کی کھرّی کھاٹ کے اوپر، ہر آہٹ پر کان دھرے
آدھی سوئی، آدھی جاگی، تھکی دوپہری جیسی ماں
چڑیوں کی چہکار میں گونجے رادھا موہن، علی علی
مرغے کی آواز سے بجتی گھر کی کنڈی جیسی ماں
بیوی، بیٹی، بہن، پڑوسن، تھوڑی تھوڑی سی سب میں
دن بھر اک رسّی کے اوپر چلتی نٹنی جیسی ماں
بانٹ کے اپنا چہرہ، ماتھا، آنکھیں جانے کہاں گئی
پھٹے پرانے اک البم میں چنچل لڑکی جیسی ماں

آگے بڑھنے سے پہلے اس نظم سے متعلق پروفیسر کوثر مظہری کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ندا نے ماں پر پورا ایک ناول
تحریر کر دیا ہے۔ کتنی جہتیں ہیں۔ اردو شاعری میں ماں کو طرح
طرح سے عقیدتوں کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ غزل میں، نظم
میں، لیکن فی الحقیقت ندا نے جس طرح کی نظم اور جس ڈکشن
میں کہی ہے، میں نے ایسی نظم کہیں نہیں پڑھی۔ ایک بات یہ بھی
یاد رکھنے کی ہے کہ ایسی شاعری کا تجزیہ کرنے سے جذبہ و احساس
کی لطافت ماند پڑ جاتی ہے۔ آخر کے شعر میں تو ماں کے وجود
کے بکھرنے یا یہ کہہ لیں کہ ماں کے اپنے وجود کو اپنی نئی نسل میں
بانٹ کر خرچ کر کے مٹ جانے کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔

(اردو دنیا دسمبر ۲۰۱۶ ص ۶۶)

اس نظم سے متعلق پروفیسر کوثر مظہری کا یہ کہنا درست ہے۔ بہ ظاہر یہ نظم مختصر ہے اور صرف پانچ اشعار پر مشتمل ہے لیکن اس نظم میں گہرائی اور گیرائی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی نظر آتی ہے۔ اصل میں یہ نظم ان کی ماں کے لیے ان کی طرف سے سچی خراجِ عقیدت ہے۔ ماں کے موضوع پر اردو شاعری میں بہت سی نظمیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن تین نظمیں اپنا الگ مقام رکھتی ہیں۔ ان میں ایک تو اقبالؔ کی نظم ''والدہ مرحومہ کی یادیں'' ہے جو یقیناً ایک بہترین نظم ہے۔ لیکن اس نظم کو علامہ اقبالؔ کے فلسفیانہ اظہار بیان نے اتنا مبہم بنا دیا ہے کہ وحدت تاثر ابھر کر سامنے نہیں آتا۔

ماں کے موضوع پر دوسری نظم فراقؔ کی ''جگنو'' ہے۔ اس میں فراقؔ نے ماں سے عقیدت کا اظہار جس پیرائے اور عقیدت کے ساتھ کیا ہے وہ علامہ اقبال سے مختلف ہے۔ فراق نے فطرت کے مناظر کے بیان میں ایک الگ ہی فضا قائم کی ہے۔ تیسری نظم ندا فاضلی کی ہے۔ ان کی اس نظم کی خاصیت یہ ہے کہ ایک تو یہ صرف پانچ اشعار پر مشتمل ہے یعنی مختصر ہے اور دوسرے ندا نے اظہار بیان کے لیے غزل کا فارم منتخب کیا ہے۔ ندا نے اس میں اپنے عقیدے کا اظہار کرنے کے لیے جن الفاظ اور جس پس منظر کا انتخاب کیا ہے وہ ان دونوں نظموں یعنی اقبالؔ

کی ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' اور فراقؔ کی ''جگنو'' میں نہیں ملتا۔ انھوں نے اس میں اپنے ماحول، اپنے گاؤں کے رسوم اور ہندوستانی تہذیب کا بھرپور خیال رکھا ہے۔ جس سے یہ نظم اپنا الگ تاثر چھوڑنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ شاید یہی وجہ رہی ہے جو وارث علوی نے ماں کے موضوع پر صرف دو ہی نظموں کا انتخاب کیا ہے۔ اس میں ایک تو فراقؔ کی نظم ''جگنو'' ہے اور دوسری ندا کی یہ نظم جس کا مصرع ''بیسن کی سوندھی روٹی پر کھٹی چٹنی جیسی ماں'' ہے۔ ندا نے اس نظم کو کوئی عنوان نہیں دیا۔

ندا فاضلی کی یہ نظم ماں کی محبت اور اس کی زندگی کی محنت اور تمام تر مشکلات کی زائیدہ ہے۔ اس نظم میں جو فضا ابھر کر سامنے آتی ہے اسے گاؤں سے تعلق رکھنے والے ہر شخص نے محسوس کیا ہوگا۔

یہ نظم ان کے چوتھے شعری مجموعے ''کھویا ہوا سا کچھ'' میں شامل ہے۔ جیسا کہ اس شعری مجموعے کا عنوان ہے ''کھویا ہوا سا کچھ'' اس پورے مجموعے میں کہیں بھی کوئی چیز کھوئی ہوئی نظر نہیں آتی لیکن جب ہم اس نظم پر غور کرتے ہیں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ ندا فاضلی نے اس مجموعے کا عنوان اسی لیے رکھا تھا کیونکہ اس نظم میں اس کو تلاش کیا گیا ہے جو کہیں کھو گیا ہے اور وہ صرف ان کی ماں ہے جو صرف اب یادوں میں باقی رہ گئی ہے۔ اپنی ماں کی وہ ساری یادیں جو گاؤں میں ان کے ساتھ جڑی ہوئی تھیں ان کو بار بار دہراتے ہوئے اس کھویا ہوا سا کچھ کو تلاش کرنے کی سعی میں وہ کامیاب ہو جاتے ہیں جو ان کے تینوں شعری مجموعوں ''لفظوں کا پل''، ''مور ناچ''، اور ''آنکھ اور خواب کے درمیان'' میں کہیں کھو گیا تھا۔ انھوں نے اس نظم میں بیسن کی سوندھی روٹی، کھٹی چٹنی، چوکا باسن، چمٹا، پھکنی، بانس کی کھری کھاٹ، آدھی سوئی آدھی جاگی، تھکی دوپہری، مرغے کی آواز، گھر کی کنڈی، نٹنی، پڑوسن چنچل لڑکی، جیسی لفظیات سے نظم کی فضا کو گاؤں دیہات کے منظر اور ہندوستانی تہذیب سے ہم آہنگ کیا ہے۔ انھیں ان سبھی چیزوں میں ماں کا عکس نظر آتا ہے۔ ان کی ماں کسی کی بہن بھی ہے، کسی کی بیوی بھی ہے، کسی کی پڑوسن بھی ہے، دنیا میں ماں ہی

واحد ایسی شخصیت ہے جو سب کی جگہ لے سکتی ہے لیکن ماں کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ ماں کی ان سب جہتوں کو ندا فاضلی نے شدت سے محسوس کیا ہے اور اس نظم میں پیش کر دیا۔

ندا فاضلی کا پہلا شعری مجموعہ ''لفظوں کا پل'' 1971 میں شائع ہوا۔ اس کا انتساب انھوں نے ماریہ، نادیہ کے نام کر کے بھی بچوں سے اپنے عشق کا ثبوت دیا ہے۔ یہ دونوں ان کی چھوٹی بہن کی بیٹیاں ہیں، جن سے ندا فاضلی کا لگاؤ رہا ہے۔ تیسرے شعری مجموعے ''آنکھ اور خواب کے درمیان'' کا انتساب بھی انھوں نے اپنی چھوٹی بہن کی چھوٹی بیٹی ماریہ کے نام کیا ہے۔ پانچویں شعری مجموعے ''شہر میرے ساتھ چل تو'' کا انتساب اپنی بیٹی تحریر فاطمہ کے نام کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے مجموعوں میں بچوں کے لیے بہت سی نظمیں لکھی ہیں۔

والد سے والہانہ عشق کے لیے ان کی نظم ''والد کی وفات پر'' پیش ہے:

تمہاری قبر پر
میں فاتحہ پڑھنے نہیں آیا
مجھے معلوم تھا
تم مر نہیں سکتے
تمہاری موت کی سچی خبر جس نے اڑائی تھی
وہ جھوٹا تھا
وہ تم کب تھے
کوئی سوکھا ہوا پتہ ہوا سے ہل کے ٹوٹا تھا
مری آنکھیں
تمہارے منظروں میں قید ہیں اب تک
میں جو بھی دیکھتا ہوں
سوچتا ہوں
وہ وہی ہے

جوتمہاری نیک نامی اور بدنامی کی دنیا تھی
کہیں کچھ بھی نہیں بدلا
تمہارے ہاتھ میری انگلیوں میں سانس لیتے ہیں
میں لکھنے کے لیے جب بھی قلم کاغذ اٹھاتا ہوں
تمہیں بیٹھا ہوا میں اپنی ہی کرسی میں پاتا ہوں

نظم کے اس حصے میں ندا کا درد و کرب چھپا ہوا ہے جب انھیں اپنے والد کی موت کی خبر ملتی ہے تو وہ ان سے بہت دور ہوتے ہیں اور چاہ کر بھی ان کی نماز جنازہ میں شریک نہیں ہوسکتے۔ ایسے میں ایک حساس بیٹے کے دل پر کیا کچھ گزری ہے ندا نے اسے اپنے کمال فن سے نظم میں پیش کر کے والد سے اپنی محبت و عشق کا اظہار کیا ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے غم کو غم کی طرح ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وہ اپنے والد کے مرجانے کے بعد ان کا عکس خود کے اندر محسوس کرتے ہیں یہ ایک بہت بڑی سچائی بھی ہے۔ نظم آگے کچھ اس طرح بڑھتی ہے اور اپنے اختتام کو پہنچتی ہے:

بدن میں میرے جتنا بھی لہو ہے
وہ تمہاری
لغزشوں ناکامیوں کے ساتھ بہتا ہے
مری آواز میں چھپ کر
تمہارا ذہن رہتا ہے
مری بیماریوں میں تم
مری لاچاریوں میں تم
تمہاری قبر پر جس نے تمہارا نام لکھا ہے
وہ جھوٹا ہے
تمہاری قبر میں میں دفن ہوں
تم مجھ میں زندہ ہو

کبھی فرصت ملے تو فاتحہ پڑھنے چلے آنا

ندا فاضلی کی اس نظم سے متعلق بشر نواز کہتے ہیں:

''زندگی اور موت کا بظاہر یہ تضاد والد کی موت پر ایک نظم میں ایک نئی اور غیر متوقع حمیت اختیار کرتا ہے اور زندگی کو احساس دلاتا ہے، یہاں موت پر ہر چیز کا اختتام نہیں بلکہ ایک سلسلہ در سلسلہ بن جاتی ہے، شکلیں اور چہرے بدلتے ہیں لیکن زندگی چلتی رہتی ہے۔ یہ نظم اپنے موضوع کے برتاؤ اور جذباتی نظم وضبط کے لحاظ سے اردو کی اہم نظموں میں سے ایک ہے۔ یہاں زندگی کی شکل جسم کے حدود توڑ کر وسیع تناظر میں نظر آتی ہے، سیدھے سادے الفاظ ایک خاص ترتیب پا کے نظم کا تانا بانا بنتے ہیں اور نظم مصرعوں میں نہیں بلکہ پوری اکائی کی صورت میں اپنی معنوی تہیں کھولتی چلی جاتی ہے''۔[۵]

یہ نظم ایک تاثر کے ساتھ مکمل ہوئی ہے۔ ندا کو اپنے والد سے عشق انھیں مرنے کے بعد ایک نیا جسم عطا کرتا ہے اور وہ خود اپنے جسم میں انھیں زندہ پاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی قبر میں خود کو ان کی جگہ مردہ قرار دے کر والد کو زندہ کر دیا ہے جو کہ ناممکن ہے لیکن یہاں مردہ کو زندہ اور زندہ کو مردہ کرنے سے ان کا مطلب صرف اور صرف والد سے والہانہ عشق کی غمازی کرنا ہے۔

ندا فاضلی کی رومانی نظموں میں اختر شیرانی جیسی یا دوسرے شعراء جیسی رومانیت نہیں ہے بلکہ ان کی رومانیت اور عشق والی نظمیں ایک انتشار لیے ہوئے ہیں۔ ''وقت سے پہلے''، ''ایک خط''، شکایت''، ''بے خبری''، ''فاصلہ''، ''دیوانگی رہے باقی''، ''انتظار''، ''سمجھوتا'' میں کہیں کہیں نفسیات اور رومانیت کی جھلک مل جاتی ہے۔ نظم ''حسن کی نفسیات'' اس سلسلے میں اہم ہے۔

اگر مندرجہ بالا نظموں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بالکل واضح طور پر ابھر کر آتی ہے کہ ندا فاضلی کا تصور عشق اپنے ہمعصروں سے قدرے مختلف ہے۔ ان کے تصور عشق میں صحتمند عناصر ملتے ہیں جو کہ حقیقت پر مبنی ہیں۔ نظم ''فقط اک تم ہی نہیں ہو'' میں ندا نے اپنا تصور عشق پیش کر کے قاری کے لیے افہام و تفہیم میں آسانی کر دی ہے۔

نظم ملاحظہ کیجئے:

تمہاری شکایت بجا ہے
مگر تم سے پہلے بھی
دنیا یہی تھی
یہی آج بھی ہے
یہی کل بھی ہوگی
تمہیں بھی اسی اینٹ پتھر کی دنیا میں
پل پل بکھرنا ہے
جینا ہے مرنا ہے
بدلتے ہوئے موسموں کی یہ دنیا
کبھی گرم ہوگی کبھی سرد ہوگی
کبھی بادلوں میں نہائے گی دھرتی
کبھی دور تک گرد ہی گرد ہوگی
فقط ایک تم ہی نہیں ہو
یہاں جو بھی اپنی طرح سوچتا ہے
زمانے کی نیرنگیوں سے خفا ہے
ہر اک زندگی اک نیا تجربہ ہے
مگر جب تلک یہ شکایت ہے زندہ
یہ سمجھو

زمیں پر محبت ہے زندہ

اس نظم میں ندا فاضلی نے عشق کو بالکل مختلف پیرائے میں بیان کیا ہے اور یہ پیرایہ ایسا ہے کہ پہلی نظر میں تو یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ نظم عشق کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ لیکن جیسے ہی قاری اس پر توجہ مرکوز کرتا ہے تو یہ نظم واضح ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور بے توجہی کی وجہ سے جو شکایت ہے اسے تسلیم کرتے ہوئے شاعر اس بے توجہی کے اسباب سامنے لاتا ہے۔ اور اس بے توجہی کو ان اسباب سے اس طرح ہم آہنگ کرتا ہے کہ محبت دائمی شکل میں ابھر کر سامنے آتی ہے۔ نظم میں پیش کی گئی پریشانیاں پھر پریشانیاں نہیں رہتیں بلکہ وہ محبت، عشق کا جزو بن جاتی ہیں۔

ندا فاضلی کے یہاں صرف رومانیت ہی نہیں ہے بلکہ انسانی دوستی اور ہمدردی سے مملو شاعری ہے۔ ان کی اس طرح کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب وثقافت کی روح نظر آتی ہے۔ ان کی نظمیں ان کے ذہنی کرب کی آئینہ دار ہیں۔

انھوں نے ان نظموں میں ذاتی تجربات ومشاہدات کے ساتھ عصری مسائل اور رومانی معاملات کو بھی پیش کیا ہے۔ ان کی رومانی نظموں میں رومانیت کے ساتھ ساتھ زندگی سے جڑی پریشانیوں، الجھنوں، روزمرہ کی ضرورتوں اور اس سے جڑے تمام مسائل کا سامنا اور ان کے حل کی تلاش ہے۔

ندا فاضلی کی نظموں کی یہ خاصیت سامنے آتی ہے کہ انھوں نے گزرے لمحات کو یکجا کر دیا ہے۔ اور یہ کام انجام دینے میں انھوں نے اپنی عمر کا ایک بہت بڑا حصہ لگایا ہے۔ زندگی کو تمام مشکلات میں جینے اور برتنے کا ہنر اپنی نظموں میں پیش کیا ہے۔ زندگی کا اصل مزہ حقیقت میں اس وقت حاصل ہوتا ہے جب انسان پریشانیوں میں گھر جائے اور ان سے نکلنے کی تدبیریں وہ خود تلاش کرے۔ وہ زندگی ہی کیا جس میں کوئی پریشانی نہ ہو۔ یہ تمام احساسات وجذبات جو ندا فاضلی نے اپنی نظموں میں پیش کئے ہیں انسان کو زندگی جینے، سجانے اور سنوارنے کا طریقہ بتاتے ہیں۔ ان کی نظم ''تنہائی'' میں ان کے داخلی احساسات وجذبات کی شدت کارفرما ہے۔ یہ نظم ان کا المیہ بھی ہے۔ وہ خود کو تنہائی سے گھرا ہوا محسوس کرتے ہیں وہ ایسا محسوس

کرتے بھی کیوں نہ جب کہ ان کے تمام اہل خانہ ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان چلے جاتے ہیں۔ وہ یہاں اکیلے رہ جاتے ہیں۔ اور پھر در در بھٹکنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ انھوں نے اس نظم میں اپنے عہد کے مسائل کو اپنی ذات میں سمولیا ہے اور اسے ذاتی غم بنا کر پیش کیا ہے۔ ندا فاضلی کا دور ایسا دور تھا کہ انسان کا سانس لینا دوبھر ہوا جاتا تھا، آدمی کو آدمیت کا ذرا بھی پاس نہیں تھا۔ ایسے دور میں تلوار یا بندوق کام نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے قلم کو اپنا ہتھیار بنا کر ان مسائل سے لڑنے کا عزم کیا اور اپنے احتجاج کو صفحہ قرطاس پر اتار دیا۔ ایک اچھی شاعری کی طرح ان کی شاعری بھی فکر کی دعوت دیتی ہے کیونکہ اچھی شاعری یا تخلیق ماضی، حال اور مستقبل کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ انھیں جب کوئی موضوع اپنی نظم کے لیے سوجھتا ہے تو ان کے ذہن میں خیالات کی بارش ہونے لگتی ہے۔

ندا فاضلی کی شاعری کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ عوام سے جڑی ہوئی ہے۔ ان کی سبھی نظموں کے موضوعات ان کے گرد و پیش کے ہی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے واقعات کو اٹھا کر انھوں نے جو نظمیں کہی ہیں وہ قاری کو متاثر کرتی ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ صرف ندا کا دور ہی انتشار و دیگر مسائل سے دوچار رہا ہے۔ بلکہ ہر دور میں کچھ نہ کچھ ایسے حالات ہوتے ہیں جو حساس ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ ندا فاضلی کی آپ بیتی ''دیواروں کے بیچ'' اور ''دیواروں کے باہر'' کو پڑھ کر صاف پتہ چلتا ہے کہ انھیں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ انھوں نے انھی مشکلات سے اپنی شاعری کا خمیر تیار کیا اور کائنات کو مختلف زاویوں سے دیکھا اور پرکھا۔ موضوعات کو انھوں نے جس فنکاری کے ساتھ اپنی نظموں میں برتا ہے وہ واقعی لائق تحسین ہے۔ ندا فاضلی کو زندگی جینے کے لیے ہر قدم پر اپنی ذات اور اپنے چاروں طرف کے حالات سے جد و جہد کرنی پڑی۔ بے راہ روی اور انتشار کے اس عالم میں جب قصبات، شہروں میں قومی، نسلی، ملکی اور سیاسی حادثات نے ہر طرف خون کا سماں پیدا کر رکھا تھا۔ ندا فاضلی نے اس دور میں گل و بلبل کی شاعری کی طرف نہ دیکھ کر اپنے سلگتے ہوئے ماحول کو دیکھا اور اسے ہی اپنی نظموں میں پیش کیا۔

نظم ''بس یونہی جیتے رہو'' اس سلسلے کی ایک کڑی ہے:

بس یونہی جیتے رہو
کچھ نہ کہو
صبح جب سو کے اٹھو
گھر کے افراد کی گنتی کرلو
ٹانگ پرٹانگ رکھے روز کا اخبار پڑھو
اس جگہ قحط پڑا
جنگ وہاں پر برسی
کتنے محفوظ ہوتم شکر کرو
ریڈیو کھول کے فلموں کے نئے گیت سنو
گھر سے جب نکلو تو
شام تک کے لئے ہونٹوں پہ تبسم سی لو

ندؔا فاضلی مظلوم وناچار اور وقت کے ستائے افراد کے دور سے واقف تھے۔ انسانیت کے کچلنے کا انھیں احساس تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نظموں کا مرکزی کردار وہ خود رہے اور خود کو انھوں نے ستم رسیدہ فرد بنا کر پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری میں اسی دبی کچلی انسانیت او رہمدردی کا نعرہ اور ظلم و جبر کے خلاف آواز پیدا ہوئی ہے۔ ان کی شاعری میں یہ احساس رنگ ونسل کے امتیاز کو ختم کر دیتا ہے اور صرف ہندوستانی بنکر ابھرتا ہے۔ ان کی نظموں میں دکھے ہوئے، اجڑے ہوئے دل کی آواز محسوس کی جاسکتی ہے۔ اسی آواز کو وہ فنکارانہ صلاحیتوں سے نظموں میں ڈھال دیتے ہیں جس سے قاری کو ان نظموں کا مطالعہ کرتے ہوئے ہر بات آپ بیتی نظر آنے لگتی ہے۔

ندؔا فاضلی نے جتنی بھی نظمیں لکھی ہیں وہ سب اسی درد وکرب اور اس کے نتیجے میں پیدا شدہ حالات اور اسکی کیفیات سے عبارت ہیں۔ ندؔا فاضلی کی نظموں کا کینوس بہت وسیع ہے۔ اس میں ان کے اردگرد کے ماحول کی عکاسی واضح طور پر دیکھی اور محسوس کی جاسکتی ہے۔ ندا فاضلی

کی نظر زندگی کے مشاہدے اور تجربے پر گہری ہے۔ نظر کی یہی گہرائی اور گیرائی زندگی گزارنے کے نئے نئے طور طریقوں سے آشنا کراتی ہے اور پھر اسے دنیا سے ایک ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے او رمایوسی و ناامیدی کے اس دور میں امید میں تبدیل ہو کر جینے کا جذبہ اور حرارت پیدا کرتی ہے۔

ندا فاضلی کی نظموں میں درخت، پگڈنڈی، گلی کوچوں، گاؤں، دیہات کی صبح و شام، پرندوں اور دھوپ چھاؤں کے بیان سے ہمارے سامنے جو تصویر ابھر کر آتی ہے وہ خالصتاً ہندوستانی معاشرے کی ہی تصویر ہے۔ نظموں کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری کا دل ایک دلکش فضا میں کھو جاتا ہے۔ نظموں میں ہمارے ہندوستان کا ایسا عکس نظر آتا ہے جو صدیوں سے انسانی زندگی کا اٹوٹ حصہ رہا ہے انہوں نے معاشرتی زندگی کی ایسی سچی تصویریں پیش کی ہیں جو ہماری تہذیبی وراثت ہیں۔ مگر وقت کبھی کسی کے لیے نہیں ٹھہرتا وقت ایک ایسا طوفان ہے جو سبھی کو بہالے جاتا ہے۔ جیسے جیسے وقت بدلتا گیا یہ خاندانی رشتے اور روایت بھی بدلتی گئیں۔ اس بے لگام تیز دوڑتی زندگی میں کسی کو احساس ہی نہیں ہو سکا اور خاندان اور سماج میں انتشار پیدا ہو گیا کہ لوگوں کو اپنے قریبی رشتوں تک کی تمیز باقی نہ رہی۔ ندا فاضلی نے اپنی نظموں میں انسان کے اسی ذہنی انتشار اور اس کے نتیجے میں پیدا کشمکش کو اپنے شاعرانہ کمال سے جس انداز میں پیش کیا ہے وہ کسی اور کی نظموں میں نظر نہیں آتا۔

نظم ''شکایت'' میں انسان کی ایک روداد چھپی نظر آتی ہے۔ آج کی اس تیز رفتار زندگی کی سچائی اس نظم میں منعکس ہے۔ شہر کی زندگی بھی بڑی عجیب زندگی ہوتی ہے یہاں انسان انسان کو نہیں پہچانتا اور باوجود کوشش کے وہ پہچاننا بھی نہیں چاہتا۔ خود اکیلا رہنا چاہتا ہے۔ شہر میں آکر انسان خود پرست ہو جاتا ہے اسے صرف اپنی ہی فکر رہتی ہے۔ ایسا خود ندا کے ساتھ بھی بمبئی میں آکر ہوا۔ گوالیار سے بمبئی کے سفر میں ندا فاضلی کو مختلف پریشانیوں کا سامنا ہوا اور انھوں نے ان پریشانیوں سے اپنی شاعری میں نئی راہ اختیار کی۔

ڈاکٹر عنوان چشتی ندا فاضلی کی نظم نگاری سے متعلق فرماتے ہیں:

> ''ندا فاضلی ایک صاحب طرز شاعر اور ادیب ہیں، شاعری میں اپنے گرد و پیش کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کو چن کر اپنی شعری

کہکشاں سجائی ہیں، اور اپنی شاعری کے موضوعات کا انتخاب کیا ہے، نیز ان پر نئے انداز سے نظر ڈالی ہے اور ان کے باطن میں جھانک کر معنویت کی نئی دنیا تک رسائی کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے رسمی و روایتی شعری زبان کو خیر باد کہہ کر بول چال کی زبان اور کچھ رسیلے انداز بیان کو وسیلہ اظہار بنا دیا ہے، ان کی شاعری میں محبت کی چمکار اپنی پوری مقصدیت اور بے باکی کے ساتھ موجود ہے''۔[٦]

ندا فاضلی دکھوں، پریشانیوں اور درد و غم میں رنجیدہ خاطر نہیں ہوتے کیونکہ مقدر سے شاکی رہنا ناشکری ہے، بعض مصلحتیں ہمیں دیر سے سمجھ میں آتی ہیں۔ وہ جو ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرنے والا ہے وہ کب اپنے بندوں کو دکھی دیکھ سکتا ہے۔ وہ جن سے زیادہ محبت کرتا ہے انھیں آزمائش بھی کڑی دیتا ہے اور کڑی آزمائش کی یہی راہ اس کے قرب کی راہ ہے۔ جب بندہ راستے کی تمام صعوبتیں جھیل کر اس تک پہنچتا ہے تو وہ اپنے بندے کو تھام لیتا ہے اور اس کے قرب کی راحت ہر رنج مٹا دیتی ہے، بالکل اس مسافر کی طرح جو صحرا کی وسعت میں پیاس سے ہلکان ہو رہا ہو اور یکایک اسے ٹھنڈے گھنے سائے میں بہتا ہوا پانی کا چشمہ مل جائے۔

ندا فاضلی اس عہد میں اپنی شاعری کا چراغ جلاتے رہے جو مختلف لہجوں کی بھیڑ میں بے انتہا مشکل کام تصور کیا جاتا تھا۔ ان کی شاعری میں ہر عمر اور ہر مزاج کی نمائندگی ملتی ہے اور وہ اس طرح اپنی شاعری کو سنوارنے میں ماہر تھے کہ ہر شخص ان کے فن شاعری پر رشک کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ شاعری کی جس معراج پر وہ تھے وہاں سے ہر کسی کا گزر ہونا ناممکن سا لگتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ان کی شاعری بالخصوص نظموں کو ہر زمانے میں پڑھا جائے گا۔ ان کی نظمیں ہر دور میں اپنی آب و تاب باقی رکھیں گی۔ ان کی شاعری ادب اور معاشرے کے بیچ رشتے کا نام ہے۔ انھوں نے نظموں میں گھر، گھر کے رشتے، گھر کے افراد، کا ذکر کیا ہے۔ یہ تو

معاملہ ان کے گھر تک ہے۔ لیکن بغور دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے سارے عالم کو ہی اپنا گھر مانا ہے۔ ان کی ذات میں کائنات بسی ہوئی ہے۔ انھوں نے نظموں میں موضوع کو احساس کے ساتھ آسان اور سادہ زبان میں سلیقے سے پیش کیا ہے۔

ندا فاضلی کو کائنات کی ہر شے میں خدا نظر آتا ہے۔ دنیا میں چاروں طرف جو بھی چیزیں ہیں ان سبھی میں کسی نہ کسی طرح اسی (خدا) کا نور جلوہ گر ہے۔ بس ضرورت ہے تو صرف یہ کہ ہم اس جلوے کو پہچانیں۔ اگر تمام چیزوں میں خدا کا جلوہ موجود ہے تو پھر مذہب وملت، رنگ ونسل، زبان اور تہذیب کی اس تفریق کے کوئی معنی نہیں، ان کی کوئی حد یں نہیں، انسان صرف انسان ہے اور اسے چاہئے کہ وہ اس بات کی آگاہی حاصل کرے۔

نظم ''خدا کا گھر نہیں کوئی'' سے یہ اقتباس پیش ہے:

خدا کا گھر نہیں کوئی

بہت پہلے ہمارے گاؤں کے اکثر بزرگوں نے

اسے دیکھا تھا

پوجا تھا

یہیں تھا وہ

یہیں بچوں کی آنکھوں میں

لہکتے سبز پیڑوں میں

وہ رہتا تھا

ہواؤں میں مہکتا تھا

ندی کے ساتھ بہتا تھا

ہمارے پاس وہ آنکھیں کہاں ہیں

جو پہاڑی پر

چمکتی

بولتی

آواز کو دیکھیں

مذکورہ نظم میں جس خیال کو پیش کیا گیا ہے وہ صوفیانہ خیال سے مملو ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ خدا کا جلوہ ہر ایک شے میں موجود ضرورت اس بات کی ہے کہ اس جلوے کو کس طرح دیکھا جائے۔ یعنی انسان ایسے اعمال کرے جس سے اس رکاوٹ کو دور کیا جا سکے جو اس کے اور خدا کے درمیان حائل ہے۔ تبھی ممکن ہے کہ وہ خدائے برتر کی خدائی سے آشنا ہو۔ ''ہمارے پاس وہ آنکھیں کہاں ہیں'' سے مراد انسان کے اعمال ہیں۔ اگر اس کے اعمال اچھے ہونگے تو وہ ضرور خدائے تعالیٰ کا جلوہ دیکھے گا۔

ندا فاضلی کی شاعری بالخصوص نظمیں معاشرے کے بہت قریب ہیں، ان کی نظمیں حقیقت پسندی، رشتوں کی نزاکت اور معاشی مسائل کی عکاسی کرتی ہیں۔ اکثر نظموں میں غم واندوہ اور مسرت وشادمانی کی لذت کی آمیزش ہے، اور ایسا ان کے ذاتی مشاہدات وتجربات کے سبب ہوا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ شاعری صرف احساسات وجذبات کے اظہار کا ایک وسیلہ ہے اور نہ ہی اس کے ذریعے دل کے حسین اور نفیس احساس کو بیان کرنا ہے۔ ہاں، یہ تو سچ ہے کہ اس میں رنگینی، حسن آفرینی اور خیال کی آمیزش سے زندگی کے قابل غور اور دلکش گوشوں یا پہلوؤں کو بیان کیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ شاعری زندگی کی الجھنوں کو بھی کافی حد تک سلجھانے کا کام کرتی ہے اور کہا بھی گیا ہے کہ شاعری سے بڑے بڑے کام لیے جا سکتے ہیں۔ زندگی کے بہت سے مقاصد شاعری کے توسط سے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ ہر دور کی شاعری میں اس دور کے سیاسی وسماجی مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔ ندا فاضلی کی نظموں میں زندگی کی ناہمواری، ذاتی اور اجتماعی دکھ درد، غم، معاشرتی اور تعلیمی عوامل کی تصویر نیز زندگی کے تمام تقاضوں کی عکاسی، خیر، غم، خوشی، احتجاج، شکایت، رشتے اور طنز کی کیفیات نے خاصی جگہ بنائی ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں کے ذریعے انسانی زندگی اور معاشرے کی تمام تلخ اور مسحور کن کیفیات کو ہمارے سامنے لانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اپنی نظموں میں زندگی کے معاشی، اقتصادی اور سماجی پہلوؤں کو بیان کر کے اپنی شاعری کا رشتہ سماج سے جوڑا ہے۔

جب ترقی پسند رجحانات کا اثر کم ہونے لگا اور جدیدیت کے اثرات شاعری میں ابھرنے لگے تو اس وقت نظموں کی ہیئت اور اسلوب میں تجربے ہونے لگے۔ ان تجربوں سے اردو نظم میں نئے آفاق روشن ہوئے۔ لیکن اس کی تقلید سے نظم بے معنی یا عام قاری کے فہم و ادراک سے دور ہوگئی اور ہر شاعر نے علامتی اسلوب اختیار کرلیا، اور نظموں پر ایک سوالیہ نشان لگ گیا۔ ندا فاضلی نے بھی اپنی نظموں میں اس طرح کا اسلوب اپنایا۔ ان کی اس طرح کی نظموں سے صرف ایک نظم کا ذکر کروں گا اور وہ ہے ''مرمت کی ضرورت''۔ یہ نظم اس سلسلے کی اہم نظم ہے:

بہت میلا ہے یہ سورج
کسی دریا کے پانی میں
اسے دھوکر سکھائیں پھر
گگن میں چاند بھی!
کچھ دھندلا دھندلا ہے
مٹا کے اس کے داغ دھبے
جگمگائیں پھر
ہوائیں سو رہی ہیں
پربتوں پر پاؤں پھیلائے
جگا کے ان کو نیچے لائیں
پیڑوں میں بسائیں پھر
دھما کے کچی نیندوں میں
ڈرا دیتے ہیں بچوں کو
دھما کے ختم کر کے
لوریوں کو گنگنائیں پھر
وہ جب سے ساتھ ہے

یوں لگ رہا ہے
اپنی یہ دنیا
جو صدیوں کی وراثت ہے
جو ہم سب کی امانت ہے
پرانی ہو گئی ہے
اس میں اب
تھوڑی مرمت کی ضرورت ہے

ان کی اس طرح کی نظموں میں جدید تخلیقیت اور تخیل کی فراوانی کے عنصر کی اکثریت ہے۔ فکری گیرائی و گہرائی اور کچھ کر گزرنے کی جستجو کا بھی عکس نظر آتا ہے۔

انھوں نے دوسرے جدید شعراء کی طرح ثقیل تراکیب اور علامتوں سے اجتناب کر کے جدید زبان کے ساتھ آسان علامتوں اور تراکیب میں بات کی۔ جدید نظم میں اتنی جدت بھی آئی کہ عام قاری کے ساتھ ساتھ ادباء کو بھی نظموں کی تفہیم وتعبیر میں اپنی ذہنی پرتوں کو کھولنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑا اور اکثر نظموں میں وہ شاعر کے مدعا تک رسائی حاصل نہ کر سکے۔ لیکن ان جدید شعراء میں ندا فاضلی نے ایسا اسلوب اختیار کیا کہ ان کی نظموں کی تفہیم میں مشکل نہ ہوئی اور ان کی نظم اپنی ڈگر پر قائم رہی۔ انھوں نے غیر مناسب علامتوں اور ترکیبوں سے اجتناب برتا۔

دراصل ندا فاضلی نے اپنی شاعری میں اپنے جذبات واحساسات کے برعکس قاری کے احساسات وجذبات کو برانگیختہ کرنے کا کام کیا ہے۔ ان کی اس طرح کی پیشکش کا مقصد کوئی نتیجہ حاصل کرنا نہیں تھا۔ ان احساسات وجذبات سے وہ قاری کو متحرک اور آمادۂ کار کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی نظموں میں خلوص جا بہ جا نظر آتا ہے کیونکہ انہوں نے دوسرے لوگوں کے مسائل کو اپنی ذات میں محسوس کر کے انسانیت اور یقین کامل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ شاعری دراصل واردات قلبی کا مظہر ہے اور ہر حساس دل پر کسی واقعے یا حادثے کا اثر گہرا ہوتا ہے لیکن اس اثر کو انہوں نے اپنی جودت طبع سے لفظ ومعنی اور احساس کا جامہ پہنا کر اس طرح

پیش کیا ہے کہ ان کی نظمیں پر تاثیر ہو گئی ہیں۔

الفاظ کا معاملہ یہ ہے کہ ان کی اپنی ہی ایک دنیا ہوتی ہے۔ ہر لفظ اپنے آپ میں مکمل ہوتا ہے انہیں الفاظ میں سے کچھ الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو حکومت کرتے ہیں اور کچھ الفاظ حفاظت کرتے ہیں اور کچھ طنز کی کاٹ لئے ہوتے ہیں، ہر لفظ کا اپنا ایک مکمل وجود ہوتا ہے۔ لفظوں کو صرف پڑھا نہ جائے بلکہ انھیں سمجھا بھی جائے کیونکہ لفظ صرف معنی ہی نہیں رکھتے بلکہ یہ ایک طرح کی تاثیر رکھتے ہیں جس سے دل ان کی گرفت میں آجاتا ہے۔

اگر ان الفاظ کے ہاتھوں میں لہجہ کا اسلحہ تھما دیا جائے تو یہ کسی بھی وجود کو چھلنی کرنے پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ الفاظ کی ان خوبیوں کی بنا پر الفاظ سے ہمارے شعراء نے خوب کام لیا ہے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے کرخت، بھدّے اور ثقیل الفاظ کا استعمال کر کے اپنے حریف کے سارے منفی جذبات کو برانگیختہ کر کے اسے گالی گلوج اور دشنام طرازی پر مجبور کر دیتے ہیں اور کبھی نرم و شیریں الفاظ سے مخالفین کو بھی اپنا ہم خیال بنا لیتے ہیں۔ شعر و شاعری کی دنیا بھی عجیب ہوتی ہے۔ یہاں کوئی اپنے محبوب سے خوش گوار باتیں کرتا ہے تو کوئی شکوے شکایت کرتا ہے کوئی زمانے کی ستم ظریفی کا شکار ہو جاتا ہے اور کوئی بے فکر ہو کر اپنی دھن میں مگن رہتا ہے۔ غرض ہر کسی کو الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے۔ سچ کہا جائے تو الفاظ نہ ہوتے تو دنیا کی ساری ترقی منجمد ہو جاتی، سائنس کا وجود ہوتا نہ زبان و ادب کے چرچے ہوتے اور نہ آج زندگی کی پیچیدگی اور مصروفیات ہی ہوتیں۔ ندا کی نظموں میں بھی یہ الفاظ مختلف طرح سے استعمال ہوئے ہیں۔

☆☆☆

حواشی (الف)

۱۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تاریخ،ص:419

۲۔ اردو نظم 1960 کے بعد مضمون جدید نظم کی شعریات اور بیانیہ, از گوپی چند نارنگ،ص: 32

۳۔ ہم کہ ٹھہرے اجنبی از فیض احمد فیض، طبع 1947،ص:81،

۴۔ بحوالہ ''ندا فاضلی کا تخلیقی سفر،ص:92،ڈاکٹر سیفی سرونجی،2010

۵۔ بحوالہ ''ندا فاضلی کا تخلیقی سفر''،ص:37،مصنف:سیفی سرونجی

۶۔ بحوالہ نداذاضلی کا تخلیقی سفر،سیفی سرونجی،ص:49-59،2010

گھیروں کے معانی سے نکلنے تو لگے ہیں
الفاظ گلی کوچوں میں چلنے تو لگے ہیں

(ندا فاضلی)

(ب)

زبان اور اسلوب

(ب) زبان اور اسلوب

ندا فاضلی کا تخلیقی شعور و فکر و آگہی، کسی کا مرہون منت نہیں بلکہ انھوں نے اسے خود عصری زندگی کے مشاہدے سے حاصل کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی فکری دنیا مربوط ہے منتشر نہیں۔ انھوں نے اپنے دکھوں کو صرف اپنی ذات تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اسے عصری بنا دیا ہے اور ہر انسان کے غم کو اپنے ہی غم کی طرح سمجھا ہے۔ اور ہر انسان کو وہ اپنے ہی جیسی مسرتیں مبہم کرنا چاہتے ہیں۔ رومین رولاں نے ایک جگہ لکھا ہے: ''بڑے فنکار وہ بھی ہوتے ہیں جو صرف اپنی ترجمانی کرتے ہیں۔ لیکن سب سے بڑے وہ ہیں جن کے دل سب انسانوں کے لئے دھڑکتے ہیں''۔

ندا فاضلی نے اپنی نظموں میں خیال و احساس کو جس نزاکت سے پیش کیا ہے وہ اپنے آپ میں خاص اور منفرد ہے۔ ان کی نظمیں ان کی ثقافت اور اس تہذیب کا عکس ہیں جن کا رشتہ ندا سے رہا ہے۔ نظموں میں احساس کی لطافت اور فکری طہارت بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کے اظہار کا اسلوب قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ ان کی نظموں میں ہمیں نہ تو فرسودگی ملتی ہے اور نہ ہی کسی طرح کا کوئی ابہام۔ بلکہ انھوں نے اس کا خمیر اپنے معاشرے اور عصری حسیت سے اٹھایا ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں کے

موضوعات میں بھی ندرت سے کام لیا ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں سیاست، سماجی مسائل، نفسیاتی گتھیاں اور رومان کو دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ اگر اسلوب کا ذکر کیا جائے تو اسلوب سے مراد وہ طرز تحریر ہے جو کوئی بھی فنکار اپنی تخلیق میں اپنے احساسات و جذبات کو پیش کرنے کے لئے اپناتا ہے۔ یہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی طور، طریقہ یا طرز کے ہیں۔ پروفیسر نصیر احمد خاں نے اسلوب کی تعریف اس طرح کی ہے:

''اسلوب انگریزی لفظ اسٹائل کے مترادف ہے جس سے مراد ایک ایسی طرز تحریر ہے جو ہر اعتبار سے منفرد ہو جو ادیب یا شاعر کی شخصیت کی مظہر ہو، جو خارجی لسانی پہلوؤں کے علاوہ فن کار کے انداز بیان، انداز فکر اور انداز تخلیق کی نمائندگی کرے''۔

(ادبی اسلوبیات، نصیر احمد خاں، ص ۹)

اسلوب سے متعلق مغربی مفکرین نے بھی تعریفیں بیان کی ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:

''اسلوب سے زبان میں معجزے کا امتزاج پیدا ہوتا ہے اور اسلوب میں بات کہنے کا سلیقہ بھی شامل ہے''۔ (ارسطو)

''کلام کی شناخت جن صفات سے ممکن ہو اسے کلام اور مصنف کا اسلوب کہتے ہیں''۔ (مرے)

شعر و ادب میں اسلوب سے مراد وہ خاص طرز تحریر یا طرز ادا ہے جس کی وجہ سے تخلیق کار کی شناخت ہر عہد میں کی جا سکے۔ اس میں تخلیق کار کی شخصیت کا بھی عکس نظر آتا ہے۔ بقول ڈاکٹر سرفراز جاوید: ''اسلوب کی تشکیل میں سب سے زیادہ اہمیت ادیب کی ذاتی شخصیت کی ہوتی ہے''۔ زبان اس کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ہوسکتا ہے اسلوب کسی جگہ پر بدلا ہوا بھی نظر آئے لیکن ہم اسے یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہاں اسلوب مختلف ہے۔ بلکہ ہم تخلیق کار کی تخلیقات کے مجموعی تاثر کو اسلوب کہیں گے۔ پروفیسر محمد حسن اسلوب سے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں: ''اسلوب وہ قوت اظہار ہے جس میں صدیوں کی تہذیب بولتی ہے۔ اسلوب وقت کا بھی ہوتا ہے زبان کا بھی، صنف کا بھی اور مصنف کا بھی۔ وہ گواہی دیتا ہے کہ زبان کی روایت میں

نمو کی قوت کتنی ہے۔اور اس کے اظہار اور فروغ میں کونسی توانائیاں کارفرما ہیں۔ ہر اسلوب محض صاحب اسلوب کی وراثت اور ذہانت ہی کی گواہی نہیں دیتا بلکہ کسی زبان اور ادب کے چھپے ہوئے خزانوں کا سراغ بھی دیتا ہے۔اور ہر قسم کی دولت کو آفتاب عالم تاب کی طرح چمکا کر از سرنو دولت بیداد کا مرتبہ دیتا ہے''۔

کلیہ کے طور پر ہمارے سامنے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلوب سے ہی کسی بھی تخلیق کار کی انفرادیت کا پتہ چلتا ہے۔میر اپنے اسلوب کی وجہ سے ہی میر ہیں۔غالب بھی اپنے اسلوب کی وجہ سے ہی غالب ہیں۔جبکہ غالب کے یہاں اکثر موضوعات وہی ہیں جو میر کے یہاں ہیں۔لیکن ان کے اسلوب کی وجہ سے ہی دونوں میں امتیاز کیا جاسکتا ہے۔مثال کے لئے میر اور قائم کے یہ اشعار دیکھئے:

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

(میر تقی میر)

اب قائم چاند پوری کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے۔

نت ہی قائم خموش رہتا ہوں
کس تہی دست کا چراغ ہوں میں

(قائم)

مذکورہ بالا دونوں اشعار میں'' مایوس دل'' کی کیفیت کا ذکر ہے۔لیکن اسے برتنے کا انداز دونوں کا مختلف ہے۔میر کا اسلوب اور قائم کا اسلوب الگ الگ لطف دیتا ہے۔اب ندا فاضلی سے متعلق گفتگو کو آگے بڑھاتے ہیں۔

ندا فاضلی کا ان اخلاقیات کے ساتھ واستہ ہے جن میں حسرت ناکامی، یاس، قنوطیت اور ناامیدی نام کے لیے بھی نہیں ہے۔ان کے ذہن نے جس طرح کی راہ ان کے لیے منتخب کی ہے وہ سرور وانبساط ہے جو مثبت اثر لیے ہوئے ہے۔ وہ شاعری کے ان تمام موضوعات کا استعمال اپنی نظموں میں کرتے ہیں جو عام شعراء نے استعمال کیا۔لیکن انھوں نے ان مضامین میں

اپنے کمال فن سے ندرت پیدا کی ہے۔ یہ بھی دیکھنے کے لائق ہے کہ اپنے پرانے وعزیز واقارب اوردوست سب کے سب آنکھوں کے سامنے اٹھتے جارہے ہیں۔ ندافاضلی بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ ندا فاضلی اپنے منفرد طرز احساس اور اظہار کے متنوع اسالیب کے ساتھ اردو نظم نگاری میں متحرک نظر آتے ہیں۔ یہ بات ہر صاحب علم جانتا ہے کہ شاعری احساسات وجذبات کا نام ہے۔ جن شعراء کے مزاج میں صوفیانہ پن ہوتا ہے ان کی شاعری میں جذبات، جوش، اور تاثیر ہوتی ہے۔ انھوں نے عاشق ومعشوق کی حیثیت میں تبدیلی کردی ہے۔ ان کے خامہ کی زد میں عالم مجاز سے جو بھی الفاظ آئے وہ حقیقت کے پیکر میں ڈھل کرآئے ان کے اس وصف سے مضامین کے ساتھ ساتھ صوفیانہ شاعری کے جدید روپ میں بھی وسعت پیدا ہوئی۔

ندافاضلی نے سادہ اسلوب، قادرالکلامی، ندرت خیال، سچے جذبات، اوراحساس کی بدولت اپنی نظموں کا دامن ایسے تابدار موتیوں سے بھردیا ہے کہ اردو شعروادب کی تاریخ میں سدا باقی رہیں گے۔ ان کی نظمیں ظاہر کرتی ہیں کہ جذبے کی شدت، اظہار کی سادگی، اور پیکر سازی ندا فاضلی کی شاعری کے بنیادی عناصر ہیں۔

ندا فاضلی کی اکثر نظموں کی ساخت بیانیہ ہے۔ انہوں نے اپنی نظموں میں زبان کا استعمال اعلیٰ تخلیقی سطح پر کیا ہے۔ کچھ نظمیں ایسی بھی ہیں جن کا بیانیہ سپاٹ ہے۔ مثال کے لئے یہ نظم ملاحظہ ہو۔

تنہا تنہا دکھ جھیلیں گے محفل محفل گائینگے
جب تک آنسو پاس رہینگے تب تک گیت سنائینگے

تم جو سوچو وہ تم جانوہم تو اپنی کہتے ہیں
دیر نہ کرنا گھر آنے میں ورنہ گھر کھوجائینگے

بچوں کے چھوٹے ہاتھوں کو چاند ستارے چھونے دو
چار کتابیں پڑھ کے یہ بھی ہم جیسے ہو جائینگے

اچھی صورت والے سارے پتھر دل ہوں ممکن ہے
ہم تو اس دن رائے دینگے جس دن دھوکا کھائینگے

کن راہوں سے سفر ہے آساں کونسا رستہ مشکل ہے
ہم بھی جب تھک کر بیٹھیں گے اوروں کو سمجھائینگے

ندا فاضلی کو اردو ہندی دونوں میں اہم مقام حاصل ہے۔ ان کی شاعری جدت طرازی لیے ہوئے ہے۔ انھوں نے اردو ہندی کے سادہ الفاظ کو ایک ہی مالا میں پرو کر نظم میں دلکشی اور جاذبیت پیدا کر دی ہے۔ ان کی نظم نگاری میں پیچیدہ الفاظ کم ہیں۔ انھوں نے سادہ اور سلیس الفاظ کو ہی اپنی شاعری کا ذریعہ بنا کر پیش کیا ہے۔ ان کی نظموں میں محاورے اور تراکیب بہت کم ملتے ہیں۔ طرز احساس، ہیئت و تکنیک، اسلوب فکر، رنگ و آہنگ ہر اعتبار سے ان کی نظمیں اہم ہیں۔ ندا فاضلی کی نظموں میں جو تہذیب ذات اور تناسب کا انداز موجود ہے وہ یونہی نہیں بلکہ انھوں نے معاشرے کے ساتھ ہمدردی، دوسروں کے غم کو اپنا غم سمجھنا یہ کام آسان تو تھا نہیں لیکن ندا فاضلی نے حقیقت میں یہ سب کام انجام دے کر اسے اپنی شاعری کا اصل اور حقیقی موضوع بنایا۔ نظم سنسار دیکھیے :

پھیلی دھرتی
کھلا آکاش
میں۔۔
چاند، سورج، کہکشاں، کہسار، بادل
لہلہاتی وادیاں، سنسان جنگل

میں ہی میں

پھیلا ہوا تھا ہر دشا میں

جیسے جیسے

آگے بڑھتا جا رہا ہوں

ٹوٹتا، مڑتا سکڑتا جا رہا ہوں

کل۔۔

زمیں سے آسماں تک میں ہی میں تھا

آج۔۔

اک چھوٹا سا کمرہ بن گیا ہوں

ندا فاضلی نے ذاتی قربتوں اور دوریوں کا اظہار جس حسیت کے ساتھ اپنی نظموں میں کیا ہے وہ بہ مشکل ہی کہیں اور نظر آئے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب ہم ان کی نظموں کا مطالعہ سرسری طور پر کرتے ہیں تو ہمیں کچھ بھی احساس نہیں ہوتا اور ہم آگے بڑھ جاتے ہیں۔ لیکن جب ہم نظموں کی تہہ میں اُترتے ہیں تو نظم کے سارے رموز و علائم ابھر کر ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ ایسا بالکل بھی احساس نہیں ہوتا کہ اتنی شدّت ان سادہ الفاظ میں بھری ہوئی ہے۔ یہ بھی بات قابلِ غور ہے کہ ان کی نظموں میں نفسیاتی کڑواہٹ، آپسی نفرت اور دنیا سے بیزاری جیسے رجحانات نہیں ملتے جس کی وجہ سے نظموں میں ہیجان کا تصور نہیں ابھرتا۔ جو بھی موضوعات ان کے مشاہدے میں آتے ہیں وہ انھیں نظم میں ڈھالنے کے لیے الفاظ کی تلاش و جستجو نہیں کرتے بلکہ وہ انھیں ان الفاظ کا پیکر عطا کرتے ہیں جن کا سیدھا رشتہ عوام اور متاثر طبقے سے ہے۔ جس سے ان کی حیثیت کی صداقت ہمارے دلوں میں اُتر جاتی ہے۔ اور ہمارا ذہن زندگی سے راہ فرار اختیار نہیں کرتا بلکہ اسی زندگی سے اپنا رشتہ استوار کر کے نئی راہیں تلاش کرنے لگتا ہے۔ یہ بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ ندا فاضلی نے کبھی نظم کہنے کے لیے زبردستی کوشش نہیں کی بلکہ جب بھی ان کے دل نے انھیں اس کے لیے اکسایا ہے وہ بے ساختہ نظم لکھنے لگے

ہیں۔اس کے لیے انھیں ذہنی مشقت اس پیرائے میں نہیں کرنی پڑتی کہ اس موضوع کے لیے نئے اور اچھوتے الفاظ کا استعمال کریں یا پھر ایسا اسلوب اپنائیں جس میں تصنع ظاہر ہو۔ایک مختصر نظم ''کھیلتا بچہ'' ملاحظہ کیجیے:

گھاس پر کھیلتا ہے اک بچہ
پاس ماں بیٹھی مسکراتی ہے
مجھ کو حیرت ہے جانے کیوں دنیا
کعبہ اور سومنات جاتی ہے

ان کی شاعری ایک ایسے لٹے ہوئے شخص کی شاعری ہے جس نے خود کو جانتے ہوئے لٹنے دیا ہو یا اس سے سبھی چیزیں اچانک چھین لی گئی ہوں۔لیکن اس المیہ پر یعنی خود کے لٹ جانے پر وہ ماتم کناں نظر نہیں آتے بلکہ انہی حالات میں جینے کی نئی نئی راہیں تلاش کرتے ہیں اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔نظم ''آخری سچ'' کا ایک حصہ ملاحظہ ہو:

وہی ہے زندہ.....
گرجتے بادل
سلگتے سورج
چھلکتی ندیوں
کے ساتھ ہے جو
خود اپنے قدموں کی دھوپ ہے جو
خود اپنی آنکھوں کی
رات ہے جو
وہی ہے زندہ
....
وہی ہے زندہ
جو چل رہا ہے

وہی ہے زندہ جو گر رہا ہے
سنبھل رہا ہے
جو لمحہ لمحہ بدل رہا ہے

ندا فاضلی کی نظموں میں جدت طرازی بھی ہے لیکن انھوں نے اسے بے معنی نہیں بننے دیا۔ جس سے ان کی نظموں میں تاثر واضح طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے۔ ان کی نظموں میں ترکیب سازی نہیں ہے کیونکہ وہ کبھی اپنے موضوع کو تصنع یا کسی رسم میں محدود نہیں کرتے۔ ان کی نظموں میں نہ تو تشدد ہے اور نہ ہی یاسیت۔ سادہ اسلوب اور برجستہ کہی گئی نظموں میں وہ تازگی ملتی ہے جو ذہن پر دیرپا اثر چھوڑ جاتی ہے۔ ان کی نظموں میں انسانی نفسیات اور فطرت کے رموز اس طرح ابھرتے ہیں کہ ہمارے سامنے ایک مکمل تصویر آ جاتی ہے جس سے سارا منظر نامہ بولتا ہوا لگنے لگتا ہے اور اس میں ہمیں اپنا عکس نظر آتا ہے۔ ہم ان واقعات سے اپنا رشتہ جوڑنے پر اس لیے مجبور ہو جاتے ہیں کیونکہ معاشرے میں اس طرح کے واقعات انسانی دل و دماغ پر سیدھا حملہ کرتے ہیں۔ وہ جس غم کو اپنی نظموں میں برتتے ہیں اس کی کیفیت انفرادی نہیں ہوتی بلکہ اجتماعی کیفیت لیے ہوئے ہوتا ہے جس سے ان کی نظمیں زمان و مکان کی قید سے باہر ہو جاتی ہیں۔ اسی لیے ان میں آفاقیت آ گئی ہے اور یہی آفاقیت انھیں اردو شاعری میں ہمیشہ زندہ رکھنے میں معاون ثابت ہوگی۔ نظم انتقام ملاحظہ کیجیے:

مسجدوں مندروں کی دنیا میں
مجھ کو پہچانتے کہاں ہیں لوگ
روز میں چاند بن کے آتا ہوں
دن میں سورج سا جگمگاتا ہوں
کھنکھناتا ہوں ماں کے گہنوں میں
ہنستا رہتا ہوں ماں کے گہنوں میں
ہنستا رہتا ہوں چھپ کے بہنوں میں
میں ہی! مزدور کے پسینے میں

میں ہی! برسات کے مہینے میں
میری تصویر آنکھ کا آنسو
میری تحریر جسم کا جادو
مسجدوں مندروں کی دنیا میں
مجھ کو پہچانتے نہیں جب لوگ
میں! زمینوں کو بے ضیا کر کے
آسمانوں میں لوٹ جاتا ہوں
میں خدا بن کے قہر ڈھاتا ہوں

ندا فاضلی نے اپنی نظموں میں جن تجربات، مشاہدات واحساسات کو پیش کیا ہے وہ سطحی نہیں ہیں بلکہ ہمیں ان کی جڑیں عام زندگی میں پیوست نظر آتی ہیں۔ انھوں نے زندگی کے فلسفے، تہذیبی افکار، زمانے کی بے اعتدالی، اور اخلاقی اقدار کو حقیقی معنوں میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں مشترکہ تہذیب، قومی جذبہ اور انسانی ہمدردی میں ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ انھوں نے فنی تقاضوں کو بروئے کار لاکر نظم کے دامن کو وسعت بخشی ہے۔ ان کی نظموں کی یہ خوبی ہے کہ وہ سادہ اسلوب وزبان میں بھی معنی کی نئی نئی جہتیں پیدا کر لیتے ہیں جو ان کی نظم نگاری پر دلالت کرتی ہیں۔

ان کی نظموں میں سادگی اور سلاست کی قوت کارفرما ہے یہ وہی قوت ہے جو شاعری کو بامعنی اور پُر اثر بناتی ہے۔ ان کی نظمیں سچائی کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان نظموں کے موضوعات کا تعلق کسی نہ کسی طور پر انسانی زندگی کی سچائی سے ضرور ہے، چاہے وہ گھر سے بے گھر ہونا ہو، اپنوں سے بچھڑنے کا غم ہو، معاشی حالات کا دکھ ہو، اخلاقی قدریں ختم ہونے کا غم ہو یا پھر ایک جگہ سے دوسری جگہ اجڑ کر بسنے کی کشمکش ہو۔ منفی اثرات نظموں میں کہیں بھی نظر نہیں آتے۔ اگر دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی نظمیں انہی منفی اثرات کا ردعمل ہیں جو اس وقت کے شعری آسمان پر چھائے ہوئے تھے۔ ان کی نظمیں تجربے اور مشاہدے کی زرخیز زمین کی پیداوار ہیں اور نظموں کے الفاظ اور منظر اسی زمین سے پیدا ہوئے ہیں جن کا رشتہ نظم

کے موضوع سے ہے۔

نفسیات زمانہ قدیم سے ہی اردو شاعری کا بالخصوص نظم کا موضوع رہا ہے۔ بعد کے شعراء نے بھی اس موضوع کو اپنایا اور خوب سے خوب تر کی جستجو میں نئے نئے زاویوں سے اسے برتا بھی۔ بہت سے شعراء کے یہاں یہ نفسیات شرارے کی طرح چمکتی ہے اور قاری کے ادراک تک رسائی کرنے میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ ندا فاضلی کی نظموں میں بھی اس کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ لیکن یہ دوسرے شعراء سے مختلف ہیں۔ جب وہ کوئی مضمون اس سے متعلق اپنی نظموں میں بیان کرتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے یہ ان کی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں بلکہ ان کے ذہن میں کوئی نظم ڈھل گئی ہے۔ اور قلم کی نوک سے قرطاس پر بہتی چلی گئی ہے۔ اس اسلوب سے ندا فاضلی کی اپنے ہمعصروں میں انفرادیت ثابت ہوتی ہے۔

ان کی نظموں کی نمایاں خصوصیات کا مختصر طور پر ایک خاکہ تیار ہوتا ہے جس میں نازک خیالی، لطافت احساس، ندرت جذبات، واردات حسن و عشق اور فطرت سے وابستگی کے ساتھ ساتھ عصری کرب، اقدار کی پامالی اور اس کا احساس، عالم کا خوفناک منظر نامہ اور حالات کے جبر کا احساس ملتا ہے۔ ان کی زبان بالکل صاف، شیریں، اور سادہ ہے۔ خیال الجھنوں اور پیچیدگیوں سے معرّا ہے۔ نازک خیالی کو بھی لطیف پیرائے میں بیان کرنا ان کا وصف ہے۔ ان کی نظموں کے محرکات میں طبعی مناسبت اور فطری ذوق کارفرما ہے۔ شوکت الفاظ، فارسی تراکیب، تشبیہات و استعارات کا اہتمام خال خال ہی نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں کہیں بھی یہ احساس نہیں ہونے دیا جس سے یہ لگتا ہو کہ وہ علم کی نمائش کر رہے ہیں۔ جس ماحول میں رہ کر انھوں نے نظمیں لکھیں وہ ماحول ضرور ظاہری چمک دمک والا تھا اور لوگ ذرا ذرا سی خامیوں کی نشاندہی کر دیا کرتے تھے۔ لیکن ندا نے اپنا اسلوب برقرار رکھا اور اسی میں اپنی انفرادیت قائم کی۔ جس دور میں انھوں نے نثری نظمیں لکھیں وہ دور نثری نظم کے لیے اچھا نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ ہر جگہ نثری نظم کی مخالفت ہو رہی تھی ایسے میں اپنا چراغ جلائے رکھنا ایک دشوار امر تھا۔ لیکن ندا فاضلی نے تخلیقی ہنرمندی سے اس کام کو انجام دیا۔

ندا فاضلی نے اپنی نظموں میں حقیقت کو مجاز کے پیکر میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ وہ ایسا کیوں نہ کرتے جبکہ ان کا رشتہ رسوم اور حقیقت پسندی سے رہا۔ وہ دونوں کو ساتھ لے کر چلے۔ انھوں نے اسی حقیقت اور سادگی سے اس خرابے کو آباد رکھنے کی سعی کی جس میں وہ زندگی گزار رہے تھے۔

اخلاق اور مذہب کے دائرے میں، معاشرے میں پیدا شدہ بدعنوانیوں پر قلم اٹھانے والا احساس جب معاشرے کی ناانصافیوں سے متنفر ہو کر انھیں بے نقاب کرتا ہے تو اس کے اس ردعمل کے لہجے میں طنز اور نشتریت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اسی احساس کے انفرادی اور معاشرے کے باہمی (اجتماعی) مزاج اور کرب کی تصویر کشی کرتا ہے۔ کمال یہ ہوتا ہے کہ شاعر جو کچھ تصویر میں نہیں ہے اسے اپنے بلند تخیل کی مدد سے دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ کسی شے یا فکر کو محسوس کرنا بھی اچھی شاعری کی دلیل ہے۔ ندا فاضلی پیچیدہ سے پیچیدہ مضمون کو آسان اور سادہ الفاظ میں بیان کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ انھوں نے ہر تصویر کو کئی زاویوں سے دیکھا پرکھا ہے۔ عصری رجحانات کو اپنی نظموں میں بڑی ہنرمندی دلآویزی کے ساتھ پیش کر کے موجودہ دور پر تبصرہ کیا ہے جو کہ اپنے آپ میں منفرد ہے۔ ان کی اکثر نظموں کے موضوعات سیاسی منظر سے ماخوذ ہیں جن میں تاریخی پس منظر سمٹا ہوا نظر آتا ہے۔ اس طرح کی نظموں کے عنوانات میں یہ قابل ذکر ہیں۔ ''ستمبر ۱۹۶۵''، ''پاسپورٹ آفیسر کے نام''، ''سرحد پار کا ایک خط پڑھ کر''، ''بیساکھیاں''، ''انتشار''، ''انسان'' اور ''پرانے کھیل''۔ نظم ''پرانے کھیل'' ملاحظہ کیجئے:

ہم تو گھنٹیاں بجتے ہی پنجروں سے
نکل کر باہر آتے ہیں
نئے نئے کرتب دکھاتے ہیں
دشمنوں کی طرح ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں
جب لڑ جھگڑ کے تھک جاتے ہیں

تو واپس اپنے پنجروں میں قید ہو جاتے ہیں
ہمیں ہماری لڑائی کی وجہ معلوم نہیں
مرغوں کی ہاتھاپائی
سانپ اور مور کی لڑائی
شیر اور بیل کی مار کٹائی
نئے راجے نوابوں کے پرانے کھیل ہیں
ہم تو صرف لڑائے جاتے ہیں
دوسروں کے لئے جینا ہے
دوسروں کے لئے جینا ہے دوسروں کے لئے مرنا ہے

ان موضوعات میں ایک الگ طرح کی بلند آہنگی اور جوش ہے اور یہ سب بے وجہ نہیں ہے۔ تقسیم ہند کے وقت ہندوستان سے بہت سے لوگ ہجرت کر گئے اور انھوں نے اجنبی زمینوں کو اپنے رہنے کے لیے منتخب کیا۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کا خاندان ہندوستان میں اپنے مکانات فروخت کر یا یونہی چھوڑ کر پاکستان چلا گیا لیکن اس خاندان کا کوئی ایک فرد ہندوستان میں ہی رہ گیا، اس سے اسے ایک طرح کا صدمہ پہنچا وہ شخص جو ہندوستان میں تنہا رہ گیا تھا وہ خود ندا فاضلی ہی تھے۔ اس دوران انھوں نے جو بھی پریشانیاں اٹھائیں انھیں اپنی قوت متخیلہ سے شاعری میں پیش کیا۔ انھوں نے اپنے دل کے احساسات کو بیان کرنے کے لیے الگ راہ نکالی۔ اس راہ میں چلتے چلتے وہ اس مقام پر آگئے جہاں وہ اپنے فن سے پہچانے گئے۔ انھوں نے اپنی پریشانیوں میں ہندوستانی تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اپنوں سے بچھڑنے کا یہ غم ابتدا میں انھیں تڑپاتا رہا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ غم بھی گزر گیا اور ان کی زندگی راہ پر آ گئی۔

معاشرے میں کچھ ایسے حقائق بھی ہوتے ہیں جو تلخ ہوتے ہیں لیکن ان پر خاص توجہ نہیں دی جاتی۔ ان حقیقتوں کا نظم کے پیرائے میں منظر عام پر آنا نئی بات ہوتی ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جو اصلیت میں محبت، بھائی چارے اور حقیقت شناسی سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ

خصوصیت ان کے ذاتی تجربات ومشاہدات اور سماجی شعور کے زیراثر پیدا ہوتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ شاعر کے تجربات، احساسات، حادثات اور ایسے ہی واقعات جو اس کی زندگی میں پیش آتے ہیں اس کی شخصیت پر ایک عکس چھوڑتے ہیں۔ اور یہی عکس شعری پیکر میں ڈھل کر اس کی شاعری میں دکھائی دیتا ہے۔ ندا فاضلی نے اپنی نظموں میں اپنے احساسات وتجربات کو خوبصورت وحسین پیرائے میں پیش کیا ہے۔ نظم ملاحظہ کیجئے:

ابھی ابھی جو گیا ہے دھکیل کر تم کو
اسے برا نہ کہو
اپنے پیر مت روکو
جو چل سکو تو چلو
ورنہ راستہ چھوڑ دو
تمہارے پیچھے بھی کچھ لوگ آرہے ہونگے
دیا کی بھیک نہ مانگو
بڑھے چلو یونہی
امڑتی بھیڑ کی لہریں ہیں تیز دھار بہت
یہاں کسی کی کسی سے نظر نہیں ملتی
نہ دوستی
نہ محبت، نہ فلسفہ کوئی
یہ راستہ ہی یہاں راستے کی منطق ہے
تلاش سب کو ہے
موقع کی بات ہے ساری
کوئی پھسلتا ہے
کوئی پھلانگ جاتا ہے
جو آگے چلتا ہے دو چار کو گراتا ہے

ابھی ابھی جو گیا ہے دھکیل کر تم کو

اسے برا نہ کہو

اپنے ملک وقوم سے عام انسان کو بھی قدرتی طور پر لگاؤ ہوتا ہے یہ فطری بھی ہے کہ انسان جس زمین پر آنکھیں کھولتا ہے اور جس زمین کی مٹی میں وہ اپنا بچپن او رجوانی کا وقت گزارتا ہے، وہ اس کے لیے دنیا کی تمام جگہوں سے عزیز ہوتی ہے۔ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ انسان کو کاروباری ضرورت اسے وطن سے دور تو لے جا سکتی ہے لیکن اس کا تعلق جو اس کے وطن سے ہوتا ہے وہ تاحیات قائم رہتا ہے۔ ہر انسان اس رشتہ یا تعلق کا اظہار مختلف پیرائے میں کرتا ہے۔ کوئی کسی چیز کو وسیلہ بناتا ہے کوئی کسی کو۔ ندا فاضلی نے اپنے وطن کی محبت کے لیے اپنی شاعری خاص طور پر نظموں کو وسیلہ بنایا ہے۔ ان کی یہ نظمیں اپنی شائستگی اور انفرادیت کی وجہ سے اردو ادب میں ایک اضافہ ہیں۔ ندا فاضلی کی نظمیں مطالعے کی دلچسپی کا ضامن ہی نہیں بلکہ شاعر کے اندر موجزن جذبات کے طوفان کی بھی عکاسی کرتی ہیں۔ جیسا کہ کہا گیا ہے کہ شاعر سماج کا نباض ہوتا ہے۔ ندا فاضلی نے اپنے دائیں بائیں کے ماحول سے مواد اکٹھا کر کے اپنے جذبات کو الفاظ کا پیکر عطا کیا ہے۔ ان جذبات واحساسات کو قاری تک پہنچانے کے لیے ندا نے آسان اور سادہ زبان واسلوب اپنایا ہے، کہیں کہیں وہ جھنجھلاہٹ کا بھی شکار ہوئے ہیں۔ اپنے اسی اسلوب سے وہ عام قاری تک اپنا پیغام پہنچانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کی عام فہم اور سلیس زبان نظم میں قاری کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتی وہ خالصتاً ایک فنکار کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ فنکار لوگوں میں احساس حسن اور سچائی برداشت کرنے کا مادہ محبت کی تپش وگرماہٹ پیدا کرتا ہے۔ ان کا ایک ایک لفظ قاری کے اندر احساس جمال کو جگمگاتا ہے۔ ندا فاضلی کی اس صفت کو ہم سادگی سے تعبیر کر سکتے ہیں، کیونکہ انہوں نے عام خیال کو مانوس الفاظ میں پیش کیا ہے۔ اس میں کسی طرح کا کوئی تصنع نہیں جس سے نظم کی تفہیم میں آسانی ہوئی ہے۔ نہ ہی خیال میں پیچیدگی ہے اور نہ ہی الفاظ ثقیل ہیں۔

ندا فاضلی کی نظمیں ہمارے معاشرے کے بہت قریب ہیں۔ حقیقت پسندی، رشتوں کی نزاکت اور معاشی مسائل کو انھوں نے نظموں میں پیش کر کے قاری کے لیے ایک نیا باب کھولا ہے۔ یہ ذاتی تجربات و مشاہدات کی دین ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ شاعری صرف احساسات و جذبات کے اظہار کا وسیلہ ہے۔ ہاں یہ تو سچ ہے کہ اس میں رنگینی، حسن آفرینی، اور خیال کی آمیزش سے زندگی کے قابل غور اور دلکش گوشوں یا پہلوؤں کو بیان کیا جاتا ہے۔ شاعری انسان کے اندر سوئے ہوئے احساسات وجذبات کو جگانے کا کام کرتی ہے۔ زندگی کے بہت سے مقاصد شاعری کے ذریعے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ ندا فاضلی کی نظموں میں زندگی کی ناہمواری، ذاتی اور اجتماعی دکھ، غم، معاشرتی اور تعلیمی عوامل کی تصویر اور تیز رفتار زندگی کے تمام تقاضوں کی عکاسی ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں کے ذریعہ انسانی زندگی اور معاشرے کی تمام تلخ حقیقتوں کو ہمارے سامنے لانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ نظم آخری سہارا ملاحظہ کیجئے:

کئی سال پہلے
اسی شہر میں وہ
نہ جانے کہاں کی زمیں سے اکھڑ کر
سمندر کی بستی میں اگنے چلا تھا
بہت سارے الفاظ تھے ساتھ اس کے
محبت کے الفاظ
نفرت کے الفاظ
بغاوت کے قصے، بدلتے زمانے
وطن کی زمینوں کے رنگیں ترانے
گزرتے ہوئے وقت کا تیز ریلا
چمکتے ہوئے سارے لفظوں کا دفتر
بہالے گیا

محبت، شرافت، عداوت، بغاوت
ہری گھاس سا، سارا سرمایہ اس کا
کڑی دھوپ میں سوکھ کر، لٹ چکا ہے
فقط ایک ہی لفظ باقی بچا ہے
'نہیں'
اک بڑا سا 'نہیں' اب تلک
اس کے ہونٹوں پہ چپکا ہوا ہے
جسے وہ لگاتار دہرا رہا ہے
کسی ڈوبتے آمی کی طرح سے
وہ کمزور جبڑوں میں تنکا دبائے
سمندوں کی لہروں سے ٹکرا رہا ہے

ندا فاضلی نے زندگی کے معاشی و اقتصادی اور سماجی پہلوؤں کو بیان کر کے اپنی شاعری کا رشتہ سماج سے جوڑا ہے۔ ان کی زندگی میں رونما ہونے والا تغیر و تبدل ان کی نظموں میں صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ندا فاضلی کی نظموں میں بے باکی، ذاتی کرب، غم، ہولناکی اور کشمکش کی آمیزش ہے۔ آدمی کی دلچسپیاں، معاشقے، پریشانیاں روایت سے انحراف اور الجھنیں، یہ سبھی چیزیں ان کی شاعری کا حصہ ہیں۔ انسان کی زندگی کی جدوجہد اس کا ذہنی انتشار اور ناامیدی و مایوسی یہ سب ان کی شاعری کے محرکات ہیں۔

ندا فاضلی کی نظموں میں وسیع النظری، شاعرانہ بلند خیالی، فکر کی پختگی اور ندرتِ خیال بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ان کا شعری شعور اور جذبات صحتمند ہیں۔ ان کی نظموں میں نغمگی، اثر آفرینی، برجستگی، سلاست اور تسلسل موجود ہیں۔ ان کی غزل، نظم، گیت، دوہے، ماہیے وغیرہ میں زورِ بیان، ایجاز و اختصار اور شائستگی کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ ندا فاضلی کی نظموں میں ایک ایسی آواز ہے جو صالح اور صحتمند طور پر اپنا وجود باقی رکھنا چاہتی ہے۔ اس آواز کو آپس کے تعلقات کی حرارت اور رشتوں سے جانکاری یا تعلق پسند

ہے۔لیکن یہ اسے اجنبی معاشرے کی بے ربط زندگی سے اس پس و پیش میں مبتلا کر دیتا ہے کہ انسان کے خیال میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے، ان کی شاعری اسی کشمکش سے تصادم کا نام ہے۔ اگر ہم ان کی نظموں کے عنوانات پر نظر ڈالیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انھوں نے اپنے ذہنی انتشار اور سماج کے تصادم کا اظہار اپنی شاعری یا نظموں کے لیے ایک نئی سمت بنا کر پیش کیا ہے جس کی وجہ سے ان کے اسلوب بیان میں ندرت پیدا ہو گئی ہے اور یہی ندرت انھیں انفرادیت بخشتی ہے۔ زمانے کے حالات اور ان کے بے وطن ہونے، اپنے لوگوں، ماں باپ، بھائی بہن سے بچھڑ کے اپنے ہی گھر میں بے گھر ہونے نے انھیں فرد اور معاشرے سے الگ کر دیا ہے۔ ان تمام باتوں سے ہی ان کی شخصیت اور خیالات میں انتشار پیدا ہو گیا ہے، جو ان کے فکر و فن میں نئی نئی جہتیں کھولتا ہے اور نئی حسیت جگاتا ہے۔ ندا فاضلی نے اسی کے ذریعہ اپنی شاعری کا ایک نیا رنگ و روپ اختیار کیا۔ بقول شخصے۔ ندا فاضلی کی شاعری مقدس نا آسودگی کی شاعری ہے۔ شہروں کی صنعتی زندگی سے نوجوانوں کی نفرت محبت والے رشتوں کی شاعری ہے جس میں انسان اپنی تکمیل کے سفر میں قدم قدم پر دوچار ہوتا ہے۔ ندا شہری زندگی کے تشنج سے پیدا ہونے والی بے چہرہ او ربے رحم تہذیب کی مشینی تیز رفتاری اور ثقاوت سے بیزار ہیں کہ یہ ان سے جینے کی ساری لذت، رشتوں کی نرمی، اور شائستگی چھینے لیتی ہے وہ اندھی دوڑ میں کچل جانے والی شخصی مسرت اور نجی لذتوں کے ماتم گسار ہیں۔ نظم مشین ملاحظہ کیجیے:

مشین چل رہی ہے
نیلے، پیلے، لال لوہے کی مشینوں میں
ہزاروں آہنی پرزے
مقرر حرکتوں کے دائرے میں
چلتے پھرتے ہیں
سحر سے شام تک پر شور آوازیں اگلتے ہیں
بڑا چھوٹا ہر ایک پرزہ

کسا ہے کیل پنجوں سے
ہزاروں گھومتے پرزوں کو اپنے پیٹ میں ڈالے
مشینیں سوچتی ہیں
چیختی ہیں
جنگ کرتی ہیں
مشینیں چل رہی ہیں

اکثر نظموں میں فکری سطح بلند و بالا نظر آتی ہے اور یہ بلندی فکر و آگہی اور تجربات و مشاہدات کے باعث ہے۔ ان کی شاعری میں کوئی بھی ایسا لفظ نہیں ملتا جو اپنی جگہ مکمل نہ ہو۔ ایک لفظ کی بھی کمی نظم کو مجروح کردیتی ہے۔ ان کی اکثر نظموں کا موضوع چلتی پھرتی زندگی اور عام انسانوں کے ساتھ پیش آنے والے واقعات ہیں۔ ان سارے واقعات کا تعلق خود ندا فاضلی سے رہا ہے۔ انھوں نے نادر خیال اور فنی مہارت، لفظیات کا آسان اور برمحل استعمال اور آہنگ کی دلکشی سے نظموں کو جو فضا بخشی ہے وہ قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔

انھوں نے زندگی کے اکثر احساسات کو آزمائش سے اپنی فنی کاوشوں کے ساتھ نظموں میں برتا ہے۔ سماجی، تہذیبی، معاشی، دیہی، شہری، آفاقی، فرقہ وارانہ فساد، انسان اور فطرت کا عدم توازن، فطرت کے ساتھ لگاؤ، پرندوں اور درختوں سے محبت، بچوں سے پیار، تہذیبی اقدار جیسے موضوعات کو عصری حسیت کے ساتھ پیش کر کے نظم نگاری میں اپنا منفرد مقام بنایا ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں کو سجایا نہیں ۔ بلکہ جو بھی خیال ان کے ذہن میں آتا گیا اسے پیش کرنے کے لیے جو بھی لفظ اچھا لگا بس بغیر کسی پس وپیش کے اپنا لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں کا اسلوب سادہ، نادر، دلکش اور سہل ہے۔ جسے سمجھنے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوتی ۔ ہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ آسان الفاظ کے ساتھ ساتھ انھوں نے نظموں میں جو گہرائی اور گیرائی پیدا کی ہے وہ صرف انہی کا خاصہ ہے۔ اسلوب کی یہ سادگی ان کے ہمعصروں شہریار، زبیر رضوی، باقر مہدی، محمد علوی، مخمور سعیدی اور مظہر امام کے یہاں نہیں ملتی، ان سبھی شعراء نے اپنی بات کہنے کے لیے بھاری

بھر کم الفاظ کے ساتھ مشکل ترکیبیں اور تشبیہات و استعارات کا استعمال کیا ہے ان سبھی کے یہاں نظموں کے موضوعات بھی بہت مختلف ہیں اکثر کے یہاں طویل نظمیں ہیں جیسے زبیر رضوی کی نظم ''صادقہ'' ہے۔

یہاں ندا فاضلی کے کچھ معاصرین کی نظمیں پیش کی جارہی ہیں جن کا ذکر گذشتہ سطور میں کیا گیا ہے۔

ترے خلوص کا میں معترف تو ہوں لیکن
ترے خلوص کا محور بہت بھیانک ہے

میں اس کی تلخ حقیقت کو پا چکا کب کا
تو جس طلسم میں کھویا ہوا ابھی تک ہے

نظام زیست کی تشکیل تازہ تر کرکے
بری نہیں ہے نظام کہن کی بربادی

ہر اس نظام سے لیکن ستیزہ کار ہوں میں
جو مجھ سے چھین لے فکر و نظر کی آزادی

(مخمور سعیدی)

یقین کی سانس اکھڑ چلی ہے
نڈھال خوابوں کے ہونٹ سے خاک وخوں کے شعلے ابل رہے ہیں
عزیز قدروں پہ جاں کنی کی گرفت مضبوط ہو گئی ہے
پتنگ کی طرح کٹ چکے ہیں تمام رشتے
جو آدمی کو قریب کرتے تھے آدمی سے

(اکھڑتے خیموں کا درد: مظہر امام)

اے راہ روِ فردا

آوازۂ آئندہ

کیا جانے ملے تجھ کو کب ارضِ تمنائی

ہے لمبی مسافت کے اک دشت کی پیمائی

ساحل پہ سکوں رکھ دے

موجوں کے تبسم پہ آغازِ جنوں رکھ دے

ہم زادِ سفر اپنا یہ عرصۂ امکانی

.... (ہمارے بعد: زبیر رضوی)

ہندوستانی تہذیب کی عکاسی جس طرح ندا فاضلی نے کی ہے ویسی دیگر شعراء کے یہاں نہیں ہے اور نہ ہی ندا فاضلی کی طرح آسان اور عام فہم زبان والفاظ کا استعمال کیا ہے۔ اختصار ندا کا خاصہ ہے۔ انھوں نے کسی بھی موضوع کو پھیلایا نہیں ہے۔ اس کے برعکس دوسرے شعراء نے موضوع کو بہت پھیلا کر پیش کیا ہے اور اکثر اوقات کلام مبہم ہوگیا ہے۔ اور انھوں نے اس طرح کے الفاظ استعمال کیے ہیں جس سے نظم کے مفہوم میں وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ اس کے لیے انھوں نے منفرد الفاظ کا انتخاب کیا ہے اور یہ الفاظ مشکل نہیں بلکہ ایسے ہیں جن کا استعمال ہم روزمرہ کی زندگی میں کرتے ہیں۔ ان کی تقریباً سبھی نظمیں اسی سادگی پر محیط ہیں۔

عالمی تناظر میں انھوں نے اپنے فکر واحساس کا تجزیہ کر کے تمام اتھل پتھل کو مدنظر رکھ کے اپنا جوزاویہ نگاہ بنایا اسے بھی ہندوستانی تہذیب کا پیکر عطا کر کے پیش کیا ہے۔ اور اسی سے عصری آگہی کا پیغام دیا ہے۔ جدید شاعری میں انھوں نے اپنی نظموں سے جو تخلیقی صناعی کا ثبوت پیش کیا ہے وہ ان کے ہمعصروں میں کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی بہت سی نظموں میں اس بلا کا آہنگ ہے کہ وہ نظم کی خوبصورتی کو دوبالا کر دیتا ہے اور قاری کے دل وذہن پر نشاط کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔

جدید شعراء میں میراجی اور ن۔م۔ راشد کی طرح ندا کی شاعری میں ابہام

نہیں بلکہ ان کے یہاں اس کی صرف جھلک ہی نظر آتی ہے۔ میراجی کے یہاں ابہام اتنا زیادہ ہے کہ ان کی اکثر نظموں کو سمجھنے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے۔ ندا فاضلی نے ابہام کو اپنایا تو ہے لیکن اس حد تک نہیں کہ قاری کو سمجھنے میں دشواری ہو۔ ابہام ان کی نظموں میں ہوتا بھی کیوں نہ، وہ بھی تو اسی جدید شعراء کی صف میں شامل تھے جنھوں نے اپنے خیالات کو ابہام کے ساتھ پیش کیا۔

فسادات سے متعلق بہت سی نظمیں ایسی ہیں جو پہلی نظر میں ہی سمجھ میں آجاتی ہیں۔ عام زندگی میں مصیبتوں، فسادات کے ظلم اور دیگر ایسی ہی پریشانیوں کے شکار دل و ذہن پر ایسے بہت سے حادثات کا عکس ہوتا ہے جن کو شعراء اپنی شاعری میں ادا کرتے ہیں۔ ندا فاضلی کو عملی زندگی کی سوجھ بوجھ تھی۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور علم کی گہرائی و گیرائی ان کے مزاج میں بسی ہوئی تھی۔
نظیر نے اپنی نظموں میں ہندی الفاظ، ہندوستانی تہذیب اور قومی یکجہتی کو پیش کر کے اپنی شاعری کو مستحکم کیا جسے بعد کے دیگر شعراء نے آگے بڑھایا۔ لیکن جس طرح سے ندا نے نظیر کی اس روایت کو آگے بڑھایا ویسا کوئی دوسرا نہ کر سکا۔ فراق گورکھپوری نے اپنی شاعری میں ہندی بولی اور ہندوستان کی تہذیب کا عکس ضرور پیش کیا لیکن وہ ندا فاضلی سے مختلف ہے۔ شاید وہ اپنے مزاج کی مطابقت کی وجہ سے اس اسلوب کو مکمل طور پر اپنا نہ سکے اور اس سے سرسری طور پر گزر گئے۔ ان کی نظم ''آدھی رات'' میں اس اسلوب کے اچھے اشارے ملتے ہیں۔ ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہئے کہ فکر کا تصادم حسیت سے ہوتا ہے اسی تصادم کے ذریعہ ندا فاضلی نے نظموں میں عصری حسیت کی عکاسی کی ہے۔

نثری نظم کے معاملے میں جو ملکہ میراجی کو حاصل ہے وہ ندا کو نہیں۔ لیکن ندا فاضلی کے اسلوب نے ایک الگ آہنگ اور ندرت خیال سے نظم کو آشنا کیا اور اپنے لیے نئی راہ تلاش کی۔ نظم کے موضوع اور قاری کے بیچ ندا فاضلی نے جس زبان کا استعمال کیا ہے اس کی جڑیں ہندوستانی مٹی میں پیوست ہیں جس کی وجہ سے ان کی نظموں کی فضا میں ہندوستانیت چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنے شعری اسلوب کی مروجہ آرائش و زیبائش سے اجتناب کیا ہے۔ انھوں نے صوتیائی آہنگ پیدا کر کے نظم کی فضا کو پرتاثیر بنا دیا ہے۔ ندا

فاضلی کے برتے گئے موضوعات ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ کچھ نظموں میں انھوں نے منظرنامے کو الگ الگ تصویروں میں اس طرح پیش کیا ہے کہ ان میں کولاژ کی سی صفت پیدا ہوگئی ہے۔ چھوٹے چھوٹے موضوعات کو ایک ہی نظم میں پیش کر کے جو منظرنامہ وہ بناتے ہیں وہ کولاژ کی ہی مثال ہے۔ اس طرح کی نظموں میں ''فریب''۔ ''آخری سہارا'' اور ''بھور'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ نظم ''فریب'' ملاحظہ کیجیے:

وہ نہ آیا ہے، نہ آئے گا
یونہی صدیوں سے
پانی بے لہر ہے
چپ چاپ کھڑے ہیں پربت
راستے جاگتے رہتے ہیں
ہر ایک آہٹ پر
چونک جاتے ہیں
مگر کوئی نہیں
کسی بجتے ہوئے شیشے کی کھنک
دور اڑتے ہوئے پنچھی کے پروں کی لرزش
کوئی ناکام اکیلی لغزش
وقت مٹھی میں بندھی ریت سا ذرہ ذرہ
انگلیاں چیر کے بہتا ہی چلا جاتا ہے
کہکشاں کھلتی ہے سر پر
نہ سمٹتی ہے زمیں
صرف پرچھائیاں آتی ہیں گزر جاتی ہیں
وہ نہ آیا ہے نہ آئے گا ۔۔۔ کبھی

اپنی نظموں میں نئی شعری جمالیات کو برتنے والے ندا فاضلی ایک منفرد شاعر

ہیں۔انھوں نے منفرد حسی کیفیتوں سے اپنی نظموں کی تشکیل کی ہے۔ان کا اسلوب کسی سے مستعار لیا ہوا نہیں ہے بلکہ انہوں نے اس کی اختراع کی۔مختصر نظم کہنے کے لیے ہنر مندی او رفنکارانہ دسترس کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔بہت کم الفاظ میں فکری ارتکاز کے ساتھ اپنا مدعا کہنا واقعی ایک بہت ہی مشکل امر ہے۔بات کو اس طرح سے بیان کرنا کہ یہ کسی بھی پہلو سے تشنہ نہ رہ پائے اور نظم اپنا تاثر بھی برقرار رکھے۔نظم میں معنویت بھی ہو اور وہ نظم کے تقاضوں کو بھی پورا کرتی ہو۔ندا فاضلی نے اپنی مختصر نظموں میں مذکورہ بالا تمام باتوں کا پورا خیال رکھا ہے۔ان کی نظمیں ''نوح بہت روئے''، ''نوکیلا پتھر''، ''باغ''، ''ان کے نام نہیں ہوتے''، ''بے قصور''، ''نیا دیوتا''، ''محبت''، ''سماجی شعور''، ''کامیاب آدمی''، ''اتفاق''، ''فاتحہ'' اور ''کچی دیواریں'' مختصر نظموں کے سلسلے کی بہترین نظمیں ہیں۔

ندا فاضلی کی سادہ گوئی اور فکر ونظر کی پختگی کی بہترین مثالیں انکے کلیات ''شہر میں گاؤں'' میں مل جاتی ہیں۔ان کا شعری رویہ ان کے ہمعصروں سے مختلف ہے۔ان کی نظم ''سوال پوچھتے رہو'' میں ان کے شعری رویہ کا جو عکس ہمارے سامنے آتا ہے وہ بالکل منفرد ہے۔اس نظم میں فکر واحساس کی تمازت کے علاوہ ہلکے ہلکے طنز کی ایک زیریں لہر بھی جگہ جگہ نظر آتی ہے جو نظم کو انفرادیت بخشتی ہے۔طنز کی یہ لہر زندگی کے تلخ وترش تجربوں سے غیر شعوری طور پر ان کے کلام میں در آئی ہے لیکن اس سے ایک نئی فکری جہت کا اضافہ بھی ہوا ہے۔اور نظم میں گہرائی و گیرائی بھی پیدا ہوگئی ہے۔نظم ملاحظہ کیجیے۔

سروں پہ آسمان تھا
قدم قدم زمین تھی
دھواں دھواں ہے آسماں
زمین کھو گئی کہاں؟
برس رہی ہے تیرگی
نہ ہاتھ ہیں نہ پاؤں ہیں
نہ شہر ہیں نہ گاؤں ہیں

صدائیں ہی صدائیں ہیں

وطن، چراغ، خون، ڈر

عرب، یہود، کینسر

چناب، یہود، چین، گھر

سیاہ سفید بے لگام

توا، کڑھائی، ویت نام

سوال ہی حیات ہے

سوال کائنات ہے

سوال ہی جواب ہے

سوال انقلاب ہے

کوئی جواب دے نہ دے

سوال پوچھتے رہو

ندؔا فاضلی کی نظمیں اجتماعیت کی تصویروں سے بھری پڑی ہیں۔ کیونکہ ان کا تعلق اپنے عہد اور اس عہد کے لوگوں سے براہ راست رہا ہے۔ انھوں نے روایت کے ذریعہ اپنے ذاتی تجربوں کو اجتماعی بنادیا ہے۔ ان کی فکر ونظر اور شاعری میں تضاد بالکل بھی نظر نہیں آتا۔

ندؔا فاضلی نے کبھی سیاسی افکار کو بالواسطہ طور پر اپنی نظموں میں پیش نہیں کیا۔ لیکن انھوں نے ایسی بہترین اور پر اثر نظمیں تخلیق کی ہیں کہ سیاست کا منظر نامہ ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ ''ایک سیاسی رہنما کے نام'' ان کے سیاسی افکار ونظریہ کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ زندگی کی معنویت کی تلاش ہمیں ان کی نظموں میں ملتی ہے۔ ان کا شعری شعور واضح اور پختہ ہے۔ انھوں نے اپنے ذاتی اور داخلی تجربات کو وسیع پیمانے پر اپنی نظموں میں برتا ہے۔ نظم ''ایک خط''۔ ''جسم کی جستجو''۔ ''انتظار'' اس کی غماز ہیں۔ نظم ''انتقام'' میں انھوں نے مخصوص لفظیات کا استعمال کر کے خدا کے وجود کو پیش کیا۔ ''چاند بن کے آتا ہوں''، سورج سا جگمگاتا ہوں''، ''کھنکھناتا ہوں ماں کے گہنوں میں''، ہنستا رہتا ہوں چھپ کے بہنوں میں''، ''آنکھ

کا آنسو'' ''جسم کا جادو'' سے اس نظم میں خدا انسانوں سے مخاطب ہوتا ہے۔ ندا فاضلی اپنے اندر حساس اور دردمند دل رکھتے ہیں۔ یہی وجہ رہی ہے جو ان کی نظموں میں تندہی اور تلخی ملتی ہے۔ مگر وہ اپنے کمال فن سے اس میں شاعرانہ دلکشی پیدا کر کے اس تندہی اور تلخی کو مجروح نہیں ہونے دیتے۔ وہ اپنی نظموں میں عام بول چال کے الفاظ کا استعمال اس طرح کرتے ہیں کہ وہ فن بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن نے ندا فاضلی کے اسلوب و شعری شعور سے متعلق اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا ہے:

> ''ندا فاضلی نے ذات کے اظہار تبدیلی کی خواہش، صنعتی دور کے تشنج اور شعریت کے نئے پیکر تلاش کرنے کی کوشش کی او رار دو نظم کو ایک جدید فضا سے آشنا کرایا۔ ندا نے اختر الایمان سے لے کر باقر تک سب سے اثرات قبول کیے ہیں۔ لیکن ان اثرات پر قناعت نہیں کی۔ ان کو اپنی انفرادیت میں ڈھال کر نیا رنگ و آہنگ عطا کیا ہے۔ صنعتی دور کے شہروں کے اعصاب شکن زندگی کی ایسی بھرپور تصویریں ندا کے علاوہ شاید ان کے کسی معاصر کے کلام میں ملیں''۔[1]

ندا فاضلی کی نظموں میں ہندوستان کی تہذیب کا عکس صاف طور پر نظر آتا ہے۔ ان کی نظموں کی معنویت شاعرانہ سطح پر اہم اور بلند ہے۔ انھوں نے روزمرہ کی عام بول چال کے سادہ، آسان اور ہندی الفاظ کو اپنی نظموں میں ایک خاص آہنگ کے ساتھ پیش کیا ہے اور یہی ان کا شاعرانہ کمال ہے۔ ان کی نظموں میں مکمل انسانی زندگی اور تہذیب وتمدن کے سبھی ادوار کا احاطہ ملتا ہے اور یہ عالمی پیمانے پر ہے جو اپنے اندر وسعت و گہرائی لیے ہوئے ہے۔ ندا فاضلی کی نظموں کے موضوعات میں بہت وسعت ہے۔ ان کی نظموں میں انسان کی داخلی و باطنی پیچیدگیوں کو سلجھانے کی کوشش بھی ہے۔ تنہائی، مایوسی، ناامیدی، بے چینی، بے بسی، بے کسی، ہجر نصیبی، وصل و فراق کا غم عاشق و معشوق کے حسن و جمال کا ذکر بھی ہے۔ انھوں نے کہیں کہیں محبوب کی اداؤں، اس کی نازکی، اس کی انگڑائی

کو بڑے لطف کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کی نظموں میں ان کے عہد کے سیاسی شعور کا عکس نظر آتا ہے۔

ندا فاضلی نے وضاحتی اور انسلا کی اسلوب اختیار کر کے اپنے خیالات و جذبات کو نظموں میں پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ حالانکہ ان کی کچھ نظمیں استعاراتی اسلوب بیان پر بھی مشتمل ہیں۔ انہوں نے وقت کے تسلسل اور اس کے بہاؤ کی کیفیت کا خاکہ نظموں میں اس انوکھے انداز سے پیش کر کے خود کو اپنے معاصرین میں منفرد بنایا۔ ندا فاضلی نے انسانی نفسیات اور جبلت کا بھی مطالعہ کیا ہے جس کا عکس ہمیں ان کی شاعری میں ملتا ہے۔

ندا فاضلی ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے ایک ستون تھے۔ ان کی شاعری میں انسانی درد، بے چینی، بے داری، پیار، محبت، ماں، باپ، بچے، بھائی بہن، تہوار، شہر، گاؤں، فطرت، جیسے تمام عناصر موجود ہیں۔ ان کی شاعری حقیقت میں درد بھرے دل کی آواز ہے۔ زبان میں سادگی معنی میں گیرائی و گہرائی ہی ان کی خاص پہچان ہے۔ ان کی شاعری میں غالب کی معنی آفرینی، میر کا عشق، سورداس کا ہجر اور کبیر داس کے فقیرانہ انداز کا امتزاج ملتا ہے۔ سورداس کا عکس ان کی شاعری میں کیوں نظر نہ آتا، انھیں لکھنے کی تحریک ہی سورداس کے کلام کو سن کر ہوئی تھی (بقول ندا فاضلی) ان کا ایک شعر ہے:

ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی
جس کو بھی دیکھنا ہو کئی بار دیکھنا

اس شعر کی تحریک انھیں خود سورداس ہی سے ملی ہے۔ ندا فاضلی نے خود کہا ہے کہ اردو میں دس بیس کی تشبیہ دینے کی روایت نہیں رہی ہے پھر بھی مجھے سور کا "اودھو من نہ بھے دس بیس" اتنا اچھا لگا کہ اسے شامل کر لیا۔

ندا فاضلی کی شاعری نظیر کی طرح عوامی شاعری ہے۔ ان کی شاعری میں انقلابی لہجہ نہیں ملتا اور نہ ہی کہیں بغاوت کا عکس نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں، غزلوں میں توازن برقرار رکھا ہے۔ ان کا شعری احساس شگفتہ ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری خاص طور پر نظموں میں

خلاقانہ بصیرت اور اجتہادی جسارت سے اردو نظم نگاری میں ایک علاحدہ مقام حاصل کیا ہے۔

وہ نظموں میں کسی بھی موضوع پر جب گفتگو کرتے ہیں تو ان کے لطیف اشارے اس کی تفہیم میں کافی مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ ان کا مخصوص لہجہ اور انداز نظر اس کی پہلوداری اور تہہ داری، کم الفاظ میں زیادہ کہنے کا وصف ان کی پہچان ہے۔ حالانکہ انھوں نے اپنی نظموں میں روایتی مضامین بھی پیش کیے ہیں لیکن ان کا اسلوب انھیں ان تمام شعراء سے منفرد بناتا ہے۔ یہ وہ مضامین ہیں جنھیں خود ذاتی طور پر محسوس کیا ہے۔ انھوں نے قدیم روایات کی پاسداری کی ہے اور اپنے لب و لہجے، اسلوب، زبان و بیان کے ساتھ ساتھ جدید شاعری کے تقاضوں کو بھی خوب نبھایا ہے۔ ندا فاضلی منٹو کے افسانے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' سے متاثر تھے انھوں نے اس کا ذکر اپنی ایک نظم میں کیا ہے۔ نظم مختصر ہے۔ ملاحظہ ہو:

تم نے مارا ایک ہمارا ہم نے مارا ایک تمہارا
جیل کے اندر جیل کے باہر وہ ہی موسم وہ ہی نظارہ
منٹو کے پاگل خانے سے نکلا نہیں ابھی بٹوارا

بٹوارے کے وقت ٹوبہ ٹیک سنگھ آدھا ہندوستان میں اور آدھا پاکستان میں تھا اسی کے مدنظر پاگلوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا رہا تھا۔ اسی کشمکش میں پاگلوں کا باشعور لوگوں کی بہ نسبت مثبت باتیں کرنا سیاست دانوں کے منھ پر ایک زوردار طمانچہ تھا۔ ندا فاضلی نے اسی پاگل خانے کا ذکر یہاں کیا ہے۔ ندا فاضلی نے اسی واقعے کی طرف اشارہ کر کے ہندوستان و پاکستان کے بیچ برسوں سے چلی آئی دشمنی کو پیش کیا ہے۔

ایک بار وہ اٹلی میں مشاعرہ پڑھنے گئے اور وہاں انھوں نے اپنی نظم ''والد کی وفات پر'' پڑھی، تو وہاں موجود یوروپین ادیبوں میں سے کسی نے پوچھا مجھے تعجب ہے تم اب بھی اپنے باپ پر نظم لکھتے ہو۔ تو اس کے جواب میں انھوں نے کہا میں جس ملک سے آیا ہوں وہاں باپ کبھی نہیں مرتا۔ ہر باپ کی موت میں اولاد کی موت ہوتی ہے۔ ایک اور واقعہ انھوں نے اپنے کسی انٹرویو میں بتایا ہے کہ ایک روز وہ غنودگی کے عالم میں تھے انھیں محسوس ہوا کہ ان کے پاؤں کا انگوٹھا ہل رہا ہے جو کہ ان کے والد کی عادت تھی۔ انھیں یہ محسوس ہونے لگا جیسے جیسے میری عمر بڑھ رہی ہے میں

اپنے اندر کم ہوتا جا رہا ہوں اور میرا باپ میرے اندر زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔

والد اور والدہ کے لیے لکھی گئیں ان کی نظمیں ان باتوں کی تصدیق کرتی ہیں کہ انھیں اپنے والدین سے حد درجہ محبت و لگاؤ تھا۔ انھوں نے ان کی یادوں کو اپنی نظموں میں ایک نشتر بنا کر پیش کیا ہے جو آہستہ آہستہ دل میں اتر کر دل کو زخمی کر دیتا ہے اور نظم کے اختتام پر قاری ایک دم خاموش و ساکت ہو جاتا ہے اور ندا کے لیے اس کے دل میں ایک ہمدردی کا جذبہ ابھر آتا ہے۔

ندا فاضلی کے نزدیک زبان کے دو درجے ہیں۔ ایک درجے کی زبان تو وہ ہے جو کرسی پر بیٹھ کر پڑھی بولی اور لکھی جاتی ہے اور دوسری وہ جو سڑک پر رکشے والے او رمزدور لوگ بولتے ہیں، یعنی عام بول چال کی زبان۔ پہلے درجے والی زبان عام زندگی سے کٹ جاتی ہے اور جو باقی رہتی ہے وہ دوسرے درجے والی زبان۔ اسی وجہ سے ندا فاضلی نے عام آدمی کی بول چال کی زبان میں شاعری کی ہے۔ انھوں نے شاعری کے بھاری اثرات کو کم کر کے لفظوں کا رشتہ اس زمین سے جوڑا ہے جو ان کے اردگرد ہے، جو بدلتی ہے اور بدلتی رہے گی۔ ان کی نظموں میں فطرت کا مشاہدہ ایک خاص نہج پر پہنچا ہوا نظر آتا ہے جس میں گہرائی ہے۔ وہ نکھار، سنوار، اور تراش خراش پر توجہ نہیں دیتے۔ الفاظ اکثر صوتی آہنگ میں نظر آتے ہیں ان کی نظمیں بھرپور پختہ کاری سے مزین ہیں۔ نظموں میں جاذبیت ہے اور مرصع الفاظ بمشکل ہی نظر آتے ہیں۔

ان کی کچھ نظمیں ایسی ہیں جن میں انھوں نے الفاظ کے استعمال سے اسلوب کو پیچیدہ کر دیا ہے جس سے نظم کی کثیر المعنویت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ زبان کی روانی، تسلسل، اور خود اعتمادی ان کی پہچان ہے۔

ان کی نظموں میں ناسٹلجیا کی کارفرمائی شدید ترین صورت میں نظر آتی ہے۔ ہجرت کا تجربہ، ان کی نظموں کی شدت میں اضافہ کر دیتا ہے لیکن ان کا اسلوب اس شدت کو کسی حد تک اپنی میانہ روی سے مدھم اور ملائم کر دیتا ہے۔ ان کی نظم نگاری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انکا فکری عمل گہرا ہے۔ اس فکری عمل کو وہ تلازمۂ خیال سے مزئین کرتے ہیں اور یہ ان کی

ذہنی تربیت، نفسیاتی کیفیت اور معاشرتی سیاق وسباق پر منحصر ہے۔ اس کے نتیجے میں نہ تو قاری کو منتشر خیالات کو اپنے طور پر ملانا پڑتا ہے اور نہ ہی اسے مشکل سے گزرنا پڑتا ہے۔ انھوں نے جو بھی موضوع اٹھایا ہے اسے تکنیک کی مناسبت سے ایک تسلسل میں پیش کردیا ہے۔ وہ ایسا انداز اپناتے ہیں جس میں ان کی جمالیاتی حس، ذوق کی بالیدگی، اظہار کی ندرت اور لطیف احساسات کی بھرپور عکاسی ہو، ان کی شاعری عام بول چال اور غیر رسمی انداز سے عبارت ہے۔ پروقار سنجیدہ موضوع یا اسلوب کسی کسی نظم میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کے یہاں واقعاتی شاعری کی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔

ندا فاضلی کی نظموں میں جدید عصری حسیت کی عکاسی کے ساتھ ساتھ فکر وفن کا حسین امتزاج بھی ملتا ہے۔ انہوں نے اپنی نظموں کے لئے کسی سہارے کی ضرورت محسوس نہ کی بلکہ دنیا میں ہونے والے تمام حادثات ومعاملات کو ہی اپنے مشاہدے میں سمو کر اس سے اپنا ایک طرح کا رشتہ استوار کیا اور یہ رشتہ روایتی نہیں ہے بلکہ اس میں جدت وندرت کے ساتھ ساتھ تفکر بھی ہے انہوں نے حزن کی کیفیت کو محض حزن ہی نہیں سمجھا بلکہ اپنے شعری افکار سے اسے ایک نئے رنگ میں ڈھالا ہے۔ ان صفات سے متعلق یہ نظم ملاحظہ ہو۔

جس گھر میں
اب میں رہتا ہوں
وہ میرا ہے

اس کے کمروں کی زیبائش
اس کے آنگن کی آرائش
اب میری ہے

مجھ سے پہلے
مجھ سے پہلے سے بھی پہلے

یہ گھر
کس کس کا؟
اپنا تھا
کن کن؟
آنکھوں کا سپنا تھا

کب کب
اس کا کیا نقشہ تھا
یہ سب تو
کل کا قصہ ہے
اس کا آج
میرا حصہ
آج کے کل بن جانے تک ہی
میرا بھی
اس سے رشتہ ہے
اب اس گھر میں
میں رہتا ہوں۔

اس نظم میں ندا فاضلی نے اپنی اسی کیفیت کو بیان کیا ہے جب وہ پہلی مرتبہ اپنا مکان خریدتے ہیں اور پہلی مرتبہ اس گھر کے آنگن میں بیٹھے ہوئے وہ سوچتے ہیں کہ یہ گھر جو کہ آج میرا ہے کل تک نہ جانے کتنے لوگوں کا رہا ہوگا۔ میری ہی طرح دوسرے لوگوں نے بھی کوئی خواب سجایا ہوگا کہ ان کا بھی کوئی اپنا گھر ہو اور نہ جانے کتنے لوگوں نے اس میں رہائش کی ہوگی۔ آج سے پہلے اس کا نقشہ نہ جانے کیا رہا ہوگا۔ بہر حال یہ گھر آج میرا (ندا کا) ہے کل کسی کا بھی رہا ہو، اب تو اس گھر میں میں ہی رہتا ہوں۔ ندا فاضلی ہی اس

نظم میں ماضی کا ذکر کرتے ہیں اور اسی ذکر میں وہ دھندلے منظر میں کھو جاتے ہیں۔ لیکن نظم کے آخری حصے میں جیسے ہی وہ لاشعور کی منزلیں طے کر کے شعور کی طرف آتے ہیں تو یہ سب کچھ واضح ہو جاتا ہے اور آخر کہ اُٹھتے ہیں کہ ماضی میں یہ گھر کسی کا بھی رہا یا اس کا نقشہ کچھ بھی رہا ہو اس وقت تو یہ میرا گھر ہے۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ دنیا میں انسان اپنی آرائش و آسائش کے لئے کیا کیا جتن کرتا ہے اور آخر میں اسے جو کچھ بھی میسر ہوتا ہے وہ اپنی حیثیت سے اپنے رہنے کے لئے مکان یا دوسرے ضروری سامان مہیا کر لیتا ہے۔ لیکن جب وہی ان اشیاء سے متعلق غور و فکر کرتا ہے تو یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ تو صرف باہری دکھاوا ہی ہے ہم جو مکان یا دوسری اشیاء پر اپنے ہونے کا دعوٰی پیش کر رہے ہیں وہ اصل میں ہمارا ہے ہی نہیں۔ ہم تو ایک مدت تک اس میں رہینگے بالکل اسی طرح جیسے اب تک مجھ سے پہلے لوگ اس میں رہتے آئے ہیں اور ایک وقت معینہ پر مجھے بھی یہ گھر چھوڑ کے عالم جاودانی کی طرف منتقل ہو جانا ہے اور میری جگہ کوئی دوسرا اسی جگہ پر پھر سے اپنا دعوٰی پیش کرے گا۔ اس پر غور و فکر کے بعد انسان کو اس دنیا کی بے ثباتی کا احساس ہو جاتا ہے۔ لیکن جیسے ہی وہ دنیاوی معاملات میں دخل دینے لگتا ہے پھر سے اسی روش پر آ جاتا ہے۔

ندا فاضلی کی شاعری میں کلاسیکی شاعری کا عنصر شامل نظر آتا ہے لیکن وہ اس کی پیروی کرتے کہیں نظر نہیں آتے، انسانیت اور انسان پرستی ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔ انہوں نے اپنی نظموں میں جدت پسند اور ترقی پسند خیالات کی آمیزش سے ایک نیا سماں باندھا ہے جو انہیں ان کے معاصرین میں منفرد بناتا ہے۔ انہوں نے اپنے اردگرد کے ماحول کا کھلی آنکھوں سے جائزہ لیا اور اسے ایک توازن کے ساتھ اپنی نظموں میں پیش کیا۔

درد و غم، خواب و خیال، غم دنیا، غم روزگار اور غم جاناں یہ سب معاملات ہر دور کے شاعر کے ساتھ رہے ہیں یہ کسی کا طرۂ امتیاز نہیں بلکہ طرۂ امتیاز تو یہ ہے کہ ان سبھی کو شاعر نے کس اسلوب کے ساتھ اور کس پیرائے میں بیان کیا ہے۔ ندا فاضلی نے اپنی نظموں میں ان سبھی کو برتا تو ہے لیکن قدیم روایت سے ہٹ کر۔ اسی روایت سے انحراف نے انہیں اردو نظم نگاری

میں وہ مقام بخشا جو دوسرے شعراء کے حصے میں نہ آسکا۔ ندا فاضلی کو ابتداء ہی سے زبان و بیان پر قدرت حاصل رہی ہے۔ انہوں نے اپنی نظموں میں علامت کا بہت ہی کم استعمال کیا ہے۔ ان کی نظموں کے عنوانات بھی ان کی فکر و آگہی اور شعری کائنات کو سمجھنے میں کافی معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ ''ایک بات''، ''ایک لڑکی''، ''دو سہیلیاں''، ''کھیلتا بچہ''، ''روتا بچہ''، پگھلتا سورج'' وغیرہ۔ یہ ان کی نظموں کے کچھ عنوانات ہیں۔ ''بے خواب نیند'' ایک اہم نظم ہے۔ لہٰذا نظم پیش ہے۔

نہ جانے کون وہ بہروپیا ہے
جو ہر شب
مری تھکی ہوئی پلکوں کی سبز چھاؤں میں
طرح طرح کے کرشمے دکھایا کرتا ہے

لپکتی سرخ لپٹ
جھومتی ہوئی ڈالی
چمکتے تال کے پانی میں ڈوبتا پتھر
ابھرتے پھیلتے گھیروں میں تیرتے خنجر
اچھلتی گیند ربڑ کی سدھے ہوئے دو ہاتھ
سلگتے کھیت کی مٹی پہ ٹوٹتی برسات

عجیب خواب ہیں یہ
بنا وضو کیے سوئی نہیں کبھی میں تو
میں سوچتی ہوں کسی روز اپنی بھابھی کے
چمکتے پاؤں کی پازیب توڑ کر رکھ دوں،
بڑی شریر ہے ہر وقت شور کرتی ہے۔

ندا فاضلی نے اس نظم میں تھکی ہوئی آنکھوں کا منظر پیش کیا ہے جب انسان تھک جاتا ہے تو وہ آرام کرنے کی غرض سے لیٹا ہوا ہے مگر کسی پریشانی کے باعث اسے نیند نہیں آرہی۔ وہ ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح سو جائے لیکن باوجود کوشش کے وہ ناکام رہتا ہے۔ اسی کشمکش میں اسے طرح طرح کے خیالات آتے ہیں اور یہ خیالات اس کے دل میں ایک طرح کا خوف پیدا کرتے ہیں۔ آخر میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ نیند نہ آنے کی وجہ یہ پائل ہے جو چلنے پر شور کرتی ہے کیونکہ نیند نہ آنے کی اور کوئی وجہ نہیں، مذہب اسلام میں کہا گیا ہے کہ اگر وضو کر کے انسان سوئے تو اسے کسی طرح کے خراب یا ڈراؤنے خواب نہیں آتے اور آسانی سے نیند آ جاتی ہے لیکن نظم کے مطابق باوضو ہونے کے باوجود بھی اس طرح کے خواب و خیالات کا آنا صرف وصرف انہی پازیب کی وجہ سے ہے۔

یہ اس دور کی حقیقت بھی ہے آج انسان بہت سی پریشانیوں میں مبتلا ہے اور اسے اس نظم میں پیش کیے گئے خیال سے گزرنا پڑتا ہے۔ ندا فاضلی کی اس طرح کی نظموں میں اتنی وسعت ہے کہ اگر ان پر کہانی بھی لکھی جائے تو شاید وہ بھی کم رہے، لیکن یہ ان کی شاعرانہ صلاحیت ہی ہے جو انہوں نے اس وسعت کو اپنی نظموں میں سمیٹ دیا ہے۔ یہی ایجاز و اختصار شاعری کو جلا بخشتا ہے۔

دیگر شعراء کی طرح ندا فاضلی نے بھی محبت و عشق سے متعلق نظمیں کہیں ہیں۔ اسی قبیل کی ایک نظم جس کا عنوان ''محبت'' ہے ملاحظہ ہو۔

پہلے وہ رنگ تھی
پھر روپ بنی
روپ سے جسم میں تبدیلی ہوئی
اور پھر جسم سے بستر بن کر
گھر کے کونے میں لگی رہتی ہے۔
جس کو۔!
کمرے میں گھٹا سناٹا

وقت بے وقت اٹھالیتا ہے

کھول لیتا ہے، بچھالیتا ہے۔

اکثر مطالعے میں یہ آیا ہے کہ محبت کو صرف جسم تک محدود کر دیا جاتا ہے اور اس کی جو روح ہوتی ہے اسے درگزر کیا جاتا ہے۔ شاعر لکھنوی نے اسی تصور کو یہاں اس شعر میں کس طرح پیش کیا ہے ملاحظہ ہو۔

لوگ عورت کو فقط جسم سمجھ لیتے ہیں

روح بھی ہوتی ہے اس میں یہ کہاں سوچتے ہیں

ندا فاضلی نے بھی اپنی اس نظم میں محبت کو جسم تک محدود کر کے پیش کیا ہے اکثر نظموں میں انہوں نے جدید مسائل اور الجھنوں کو اپنے فنکارانہ اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ ان کے یہاں ان مسائل اور الجھنوں سے کوئی جھنجلاہٹ پیدا نہیں ہوتی بلکہ وہ اسے اپنی شاعرانہ ہنر مندی سے اس طرح ہم آہنگ کرتے ہیں کہ ان کی فکر و آگہی میں گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کے شعر کہنے کا انداز اتنا دلکش ہے کہ مطالعے کے وقت قاری کو اپنے حصار میں لے لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں جمود نہیں ہے بلکہ ایک طرح کی تحریک ہے۔ مثلاً۔

گھاس پر کھیلتا ہے اک بچہ

پاس ماں بیٹھی مسکراتی ہے

مجھ کو حیرت ہے جانے کیوں دنیا

کعبہ و سومنات جاتی ہے

ان نظموں میں تصنع، ابہام اور غیر ضروری کاریگری ہمیں نام کو بھی نہیں ملتی بلکہ صحتمند عناصر سے پُر نظمیں انسانی ذہن پر اپنی چھاپ چھوڑ جاتی ہیں ایسا احساس و فکر اور عصری آگہی کے امتزاج سے ہوتا ہے۔ ان کی نظم، خودکشی، کی ابتداء مفکرانہ انداز میں ہوتی ہے۔ آج کا انسان عصری مسائل سے گھبرا کر بھاگ رہا ہے۔ زیست سے شکست کھا کر وہ خودکشی کر رہا ہے۔ نظم ملاحظہ ہو۔

کیا خوب آدمی تھا بلا کا ذہین تھا

کہتا تھا ماں کی گود سے تاریک قبر تک

اِک رستہ ہے

جس پر چلے جارہے ہیں ہم

پہیئے پہ چڑھ چکے ہیں

گھسے جارہے ہیں ہم

الجھا رہا وہ ذہن کے اندر تمام عمر

ہر پل نیا سوال تھا

جینا وبال تھا

محدود ہو کے سوچنا

اس کو محال تھا

لیڈر بنا!

نہ چور!

نہ روحانی پیشوا!

افسوس جیسے آیا تھا ویسے ہی چل دیا

ہر قد کو ناپتا تھا یہی اس کا عیب تھا

کم بخت کو یہ عیب چھپانا نہ آسکا

لوگوں کو بے وقوف بنانا نہ آسکا

کیا خوب آدمی تھا۔

لیکن ندا فاضلی نے اس نظم کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اگر وہ زندگی سے شکست کھا کر خودکشی کرے گا تو یہ اس کے لئے گھاٹے کا سودا ہوگا۔ کیونکہ خودکشی پریشانی کا حل نہیں ہے۔ اگر انسان خود کا محاسبہ کرے تو وہ اس پریشانی سے آسانی سے نکل سکتا ہے۔ اس نظم میں انہوں نے معاشرے پر طنز کیا ہے۔ کہ لوگ اصل میں ناکام رہنے کے بعد کس طرح کے ڈھونگ کرتے ہیں یا تو وہ کوئی لیڈر بن جاتے ہیں یا پھر جب کچھ کارگر نہیں ہوتا تو آخر میں

روحانی پیشوا بن بیٹھتے ہیں لیکن اس نظم میں پیش کیا گیا کردار کچھ الگ طرح کا ہے وہ سوچتا بھی مختلف ہے اور ذہین بھی ہے اور زندگی سے متعلق اپنا فلسفہ پیش کرتا ہے کہ انسان جب سے پیدا ہوتا ہے اور جب مرتا ہے تو اس دوران تمام عمر وہ کسی نہ کسی سفر میں ہی رہتا ہے یعنی اسے آزمائشوں سے لڑنا پڑتا ہے۔ وہ سوچتا بھی بڑے پیمانے پر تھا، یہ اس کی مجبوری تھی کہ وہ اپنی سوچ کو محدود دائرے میں قید نہیں کرسکتا تھا اپنی نیک نیتی اور ذہانت کے سبب اسے کچھ پریشانیوں کا سامنا ہوا اور وہ ان پریشانیوں میں گھرا رہا لیکن کبھی بھی اس نے معاشرے میں پھیلی بدعنوانیوں کا سہارا نہیں لیا اور اپنے راستے پر ہی گامزن رہا۔ آخر کار وہ مرگیا۔ اب یہاں وہ طنز کا سہارا لیتے ہیں کہ اس پر یہ عیب چھپایا نہ گیا اور لوگوں کو بیوقوف نہ بنایا گیا لیکن آدمی واقعی خوب تھا۔ طنز یہ ہے کہ آج معاشرے میں انسان انسان کو خوب بیوقوف بنا رہا ہے وہ نئے نئے حیلوں سے اپنا کام نکال لیتا ہے اب چاہے اس میں دوسرے لوگوں کا نقصان ہی کیوں نہ ہو۔ اس نظم میں انہوں نے عصری حسیت کی بہترین عکاسی کی ہے۔ سادہ اسلوب اور سادہ الفاظ کے ساتھ کہی گئی نظموں کا قاری کے ذہن پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ ان کا طرزِ اظہار شعور ہوتا ہے۔ انہوں نے موضوع کو بڑے فنکارانہ انداز میں برتا ہے۔ ندا فاضلی نے بڑی ہی عرق ریزی کے ساتھ اپنی نظم کو زمانے سے ہم آہنگ کرنے کی سعی کی ہے۔

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ ندا فاضلی کو اپنی زندگی میں جدوجہد کرنی پڑی لیکن جدوجہد میں انہوں نے مطالعہ جاری رکھا اور آگے چل کر اپنی شاعری میں آپ بیتی کو جگ بیتی بنا کر پیش کیا ہے۔ نظموں کے موضوعات وہی ہیں جو اس دور کے شعراء کے یہاں ہیں لیکن انہوں نے ان کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ان میں پرخلوص جذبے کی آنچ صاف طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ پرانے موضوعات کو ندرت کے ساتھ پیش کر کے انہوں نے اپنا الگ اسلوب اختیار کیا۔ انہوں نے عشق کو عشق کے طور پر ہی لیا ہے لیکن عشق میں ناکام ہونے کے بعد وہ اس پر ماتم کناں نہیں ہوتے بلکہ اسے ہنسی میں گزار کر اس غم کو ایک سلیقے کے ساتھ ضبط بھی کرلیتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں ذہنی بندش کا شکار ہونا نہیں چاہتے بلکہ آزاد فضا میں رہ

کر اپنا خیال پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ندا فاضلی کی نظموں میں پر مسرت فضا ملتی ہے جن میں عصری حسیت کو صاف طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ نظم ملاحظہ ہو۔

شہر میرے ساتھ چل تو
چیختے، لڑتے، جھگڑتے
کرفیو
نعروں
کے اس بازار سے باہر نکل تو
تیری آنکھوں میں
بھری ہے ریت
لگتا ہے کئی برسوں سے
تو سویا نہیں ہے
ہڈیوں میں تیری
تیرے سوچنے محسوس کرنے کا تھا
جتنا فاسفورس
مر چکا ہے
کوکو کولا، پیپسی کا رنگ
ان میں بھر چکا ہے
اب کسی بھی حادثے پر
واقعے پر
مسئلے پر
چونکتا ہے تو
نہ روتا ہے کبھی تو
جب بھی دیکھو

مورچے، جلسے، تماشے،

سچ بتا

تنہا بھی ہوتا ہے کبھی تو؟

فربہی کا جان لیوا روگ

تیرے تن بدن کو کھا رہا ہے

شہر تو---------

چاروں طرف سے

پھلتا ہی پھیلتا ہی جا رہا ہے

اس سے پہلے

گیس کے غبارے جیسا

تو اچانک پھٹ کے

ٹکڑا ٹکڑا بکھرے

شہر سن ایسا کریں ہم

دور جنگل کے کسی خاموش سے گوشے میں چھپ کر

پیاز کی گانٹھوں کو

چاقو سے تراشیں......اور روئیں

روتے روتے شناخت ہو کر...........ایک گہری نیند سوئیں

خوب گہری نیند سوئیں

ندا فاضلی کی نظموں میں اقدار کی پامالی پر آنسوں نہیں بہائے گئے اور نہ ہی کسی طرح کا کوئی فلسفہ ہی ہم ان میں پاتے ہیں، بلکہ ان کی نظموں میں سیدھا سادہ تصورِ حیات پیش کیا گیا ہے۔ ان نظموں میں ہمیں مایوسی نہیں ملتی اور نہ ہی کہیں نفرت کا شائبہ نظر آتا ہے۔ ان میں تمام عصری مسائل کا ذکر تو کیا گیا ہے لیکن ایک نئے اسلوب کے ساتھ ان میں حقیقت کا جذبہ زیادہ کا فرما نظر آتا ہے۔ مذکورہ بالا نظم میں ان کے جذبات کی

عکاسی در آئی ہے۔

اس نظم میں انہوں نے سادہ اسلوب اپنایا ہے لیکن تراکیب کے استعمال میں فراخ دلی سے کام لیا ہے۔ اس میں ان کے دل کا درد چھلکا ہے۔ آج کے شہر اور کل کے شہر میں بہت فرق ہو چکا ہے۔ پہلے شہروں میں بھی امن وامان، چین وسکون رہتا تھا زیادہ شور شرابا نہیں ہوتا تھا لیکن آج یہ حالت ہے کہ ہر جگہ شور شرابا، لڑائی جھگڑے، کرفیو اور نعروں کی آواز سے اس امن وسکون میں دخل اندازی کی گئی ہے۔ ندا فاضلی شہر سے مخاطب ہوتے ہیں کہ اب تو (شہر) اس شور شرابے والے ماحول سے باہر نکل، تیری آنکھیں ایسی لگ رہی ہیں جیسے تو کئی برسوں سے سویا نہیں ہے اور یہ بھی نظر آ رہا ہے کہ تیری ہڈیوں میں فاسفورس کی جگہ اب کوکا کولا نے لے لی ہے۔ شہر میں اتنے حادثے ہو رہے ہیں کہ تو اب ان کا عادی ہو گیا ہے۔ پہلے کی طرح اب چونکتا نہیں ہے۔ یہ سب تیرے لئے نقصان کا معاملہ ہے اب تجھے یہ کام کرنا چاہیئے کہ کسی جنگل میں یہاں سے دور جا کر چھپ جا اور حالات پر آنسو بہا کر ایک گہری نیند سو جا۔ دراصل یہ نظم ندؔا فاضلی کی علامتی نظم ہے۔ شہر کو اس میں ایک علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ نظم میں حقیقی خیال کو پیش کیا گیا ہے جو آج ایک بڑے مسئلے کے طور پر ابھر رہا ہے اور یہ روز بروز بڑھتی آبادی اور پھیلتے ہوئے شہروں کے لئے ایک چیلنج بنکر سامنے کھڑا ہے۔

ندؔا فاضلی کی ایک نظم جس کا عنوان ''سپنا زندہ ہے'' ایک عجیب خیال پیش کرتی ہے۔ اس میں ندا فاضلی کے خواب کی نوعیت کچھ الگ انداز میں سامنے آتی ہے۔ نظم پیش ہے۔

دھرتی اور آکاش کا رشتہ جڑا ہوا ہے
اسی لیے
چڑیا اڑتی ہے
اسی لیے
ندیا بہتی ہے
اسی لیے
چائے کی پیالی میں کڑواہٹ

اسی لیے تو

چہرہ بنتی ہے ہر آہٹ

دھرتی اور آکاش کا رشتہ جڑا ہوا ہے

اسی لیے تو

کہیں کہیں سے کچھ اچھا ہے

کچھ کھوٹا ہے

کچھ سچا ہے

سامنے والی کھڑکی

جوڑا باندھ رہی ہے

دھیمے دھیمے

اچھل رہی ہے

گیند ربڑ کی

اس کے پیچھے پیچھے بچہ بھاگ رہا ہے

رات اور دن کے بیچ کہیں سپنا زندہ ہے

مری نہیں ہے اب تک

یہ دنیا زندہ ہے

دھرتی اور آکاش کا رشتہ جڑا ہوا ہے۔

ندا فاضلی کی شاعری میں خواب یا سپنا کئی جگہ کارفرما ہے لیکن ہر جگہ ایک الگ نوعیت میں آیا ہے۔ کہیں یہی خواب کمزور ہے کہیں طاقتور۔ کہیں اسی خواب کو زخمی دکھایا گیا ہے کہیں یہی خواب اتنا آگے بڑھ گیا ہے کہ زندگی کے تمام مسائل کو اس نے پیچھے چھوڑ دیا ہے، ظاہر ہے کہ جب انسان کسی چیز کو پانے کی جدوجہد کرتا ہے تو اسے اس میں بہت سی الجھنیں بھی آتی ہیں اور کبھی زخمی بھی ہوتا ہے۔ مگر اسے ایک امید رہتی ہے کہ منزل مجھے مل کر رہے گی اسی امید کو لیے وہ آگے بڑھتا رہتا ہے اور بالآخر اپنی منزل کو پالیتا ہے۔

ندا فاضلی نے جو خواب سجائے تھے وہ دیوانوں کی طرح تھے۔ عام آدمی اس طرح کے خوابوں سے متعلق نہیں سوچتا۔ خواب ضرور دیکھنے چاہئیں کیونکہ انہی سے تحریک ملتی ہے۔ ندا فاضلی نے خواب تو بہت دیکھے لیکن یہ خواب انہوں نے بستر پر لیٹ کر گہری نیند میں بے خبری کے عالم میں نہیں دیکھے بلکہ آنکھیں کھول کر دیکھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں ابہام نہیں ملتا۔ جس سے قاری کا ذہن ان کی نظموں کا مطالعہ کرتے وقت بھٹکتا نہیں ہے۔ ان کی نظموں میں زندگی سے متعلق صحت مند عناصر پائے جاتے ہیں۔ اکثر نظموں میں اپنے دور کی تمام اچھائیوں اور برائیوں کا شعور اور اقدار کے زوال کا احساس پایا جاتا ہے، وہ ایک حساس دل رکھتے تھے اور اپنے عہد کے تمام اسالیب سے واقف تھے جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں قنوطیت کا ذرا بھی اثر نہیں ملتا۔ انہوں نے اپنی نظموں میں اخلاقیات کے دامن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور شکست خوردگی سے بھی دامن بچا لیا۔

ندا فاضلی کی نظموں کی روح قاری کو احساس شکست میں مبتلا نہیں کرتی بلکہ اسے ہمت وحوصلہ دیتی ہے۔ ان کی شاعری میں جدت کے ساتھ ترقی پسند رجحانات کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ وہ جدوجہد مسلسل کے قائل تو تھے ہی ساتھ میں انہیں انسانیت کے مستقبل کی بھی فکر تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ آج انسان کا جو بھی مستقبل ہے وہ کافی نہیں ہے بلکہ انہیں اپنی محنت سے ایسی کوشش کرنی ہوگی جس سے مستقبل بہتر سے بہتر بنایا جا سکے۔ ان ایک نظم ''معاہدہ'' میں ان احساسات کے اشارے ملتے ہیں۔ جن کا ذکر ابھی مذکورہ بالا سطور میں کیا گیا ہے۔

کٹی پھٹی ہیں دھرتیاں
دھواں دھواں فضائیں ہیں
لہولہو
عبادتیں ہیں

بے اثر دعائیں ہیں
وہ جنگلوں کے پہرے دار
جانور نہیں رہے
سنبھالتے تھے موسموں کو
جو شجر نہیں رہے۔
اداس گھونسلے ہیں
ان کے نغمہ گر نہیں رہے
سمندروں کی وسعتوں کو
پی رہی ہے بستیاں
عمارتوں میں چن رہی ہیں پربتوں کی چوٹیاں
ہر اک ندی کو تیاگ کر
جلاوطن ہیں دیویاں
ہوائیں تیز گام ہیں
خلائیں بے لگا ہیں
معاہدہ!
فلک سے جو زمیں کا تھا
نہیں رہا
دلوں کے آس پاس تھا جو راستہ
نہیں رہا۔

یہ نظم ''معاہدہ'' فطرت اور انسان کے درمیان تصادم کی عکاسی کرتی ہے۔ فطرت اور انسان کا جو معاہدہ کبھی ہوا تھا وہ آج ختم ہو چکا ہے اور زمین کا سینہ زخمی ہو رہا ہے۔ باغوں میں شجر کاٹے جا رہے ہیں اور اس جگہ رہنے کے لئے مکان بنائے جا رہے ہیں۔ باغ ویران ہونے سے اب پرندے بھی دوسری جگہ پر چلے گئے ہیں۔ آس پاس کہیں

ان کے گھونسلے بھی نظر نہیں آ رہے سمندروں کے کناروں پر بستیاں بس چکی ہیں۔ مکان بنانے کے لئے پہاڑوں کو توڑا جا رہا ہے۔ ندیوں کا پانی خراب ہو چکا ہے یعنی نظام درہم برہم ہو چکا ہے۔

ندا فاضلی کی اکثر نظمیں ایک قسم کی خود کلامی ہیں یا پھر ان کے وہ منتشر خیالات ہیں جو راہ نہ پا کر آخر میں یکجا ہو جاتے ہیں، ان کی نظموں میں اپنے علاوہ اپنے ماحول سے مسلسل ردِ عمل کا بھی اشارہ ملتا ہے۔ کسی شاعر کی تنہائی اور اس تنہائی سے پیدا اداسی اور کرب، کسی غیر متوقع چیز کی چاہت میں بھاگتے فرد کا اضطراب، معاشرے میں پھیلی بدعنوانی، یہ سبھی ان کے خیالات کی کڑی ہیں جسے انہوں نے اپنی نظموں میں پیش کیا ہے۔ نظموں میں الفاظ کا استعمال اسی طریقے سے ہے جس طرح غزل میں ہے۔ ندا فاضلی کی اچھی نظمیں جنکی تعداد اچھی خاصی ہے اس طرف انسان کا خیال لے جاتی ہیں کہ آپ نظم کی دنیا میں ہی ہیں۔ اس طرح کی نظموں میں یہ احساس ملتا ہے کہ آج کے انسان کو جن مشکلات سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے وہ سب آنکھوں کے سامنے ہیں۔ کچھ نظمیں ایسی بھی ہیں جن میں خیال کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ نظم سپاٹ بنکر رہ گئی ہے۔ جیسے یہ نظم ''فرق اگر ہے تو اتنا ہے'' پیش ہے۔

دیواریں
دیواروں جیسی
دروازے دروازوں جیسے
آنگن
کمرے
کھڑکی چوکھٹ
سب ویسا ہی
کاغذ پر نقشے جیسا ہی
فرق اگر ہے

تو اتنا ہی
دھرتی پر جو گھر بنتا ہے
پتھر مٹی سے بنتا ہے۔

اگر الفاظ کی یہ کڑی نظم ہے تو میں سمجھتا ہوں نظم کو ایسا نہیں ہونا چاہیئے اس میں کچھ تو تجسس یا پھر کچھ ایسی دلکشی ہونی ہی چاہیئے جس سے خود بخود یہ لگنے لگے کہ ہم نظم پڑھ رہے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ شاعری میں موضوع کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ مجھے اس بات سے اختلاف ہے۔ اگر شاعری میں موضوع کی اہمیت نہ ہوگی تو اچھی شاعری کا وجود کس طرح پیش آئے گا اور اگر یہ کہا جائے کہ اہمیت اس بات کی ہے کہ خیال کو کس طرح برتا گیا ہے تو یہ بات ایک حد تک تو درست معلوم ہوتی ہے کہ موضوع بھی اچھا ہو اور اسے برتا بھی اچھے طریقے سے گیا ہو لیکن موضوع اچھا نہیں ہے لیکن اسے برتا اچھے طریقے سے گیا ہے تو شعر کی روح میرے خیال میں زندہ نہیں رہ سکتی۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ندا فاضلی کی شاعری ایک ایسے شاعر کی شاعری ہے جس کا ذہن باخبر ہے اور یہ ہمارے ماحول کے ساتھ ساتھ عالمی تناظر سے بھی متعلق ہے۔ ایسی شاعری وہی کر سکتا ہے جو اردو ادب کے عالمی ادب پر بھی نگاہ رکھتا ہو۔

ندا فاضلی کا مطالعہ بھی وسیع تھا۔ اسی کے ساتھ ان کے احباب کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا۔ شعر و ادب اور فنون لطیفہ کے ہر شعبہ کی نامور ہستیاں ان کے حلقۂ احباب میں شامل تھیں ۔ وہ اردو زبان کی اس نسل کی آخری نشانیوں میں سے تھے جن کو ملک کی دوسری زبانوں کے علمی اور ادبی حلقوں میں بھی قابل قدر اثر ورسوخ حاصل تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ تخلیق کار اپنے خیالات کے اظہار کے لئے آزاد ہوتا ہے اور اسے آزاد ہی ہونا چاہیے۔ لیکن لوگ اس کی اس آزادی کو بھی قید کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسے اپنے سانچے میں ڈھالنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ حقیقت میں یہ تخلیق کار کے ساتھ ناانصافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں آزادئ ذہن کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ انہوں نے اپنی فکر کا دائرہ محدود نہیں رکھا۔ یہی شیوہ ان کی نظموں میں کارفرما ہے۔ اس کے علاوہ ان کی نظموں میں مایوسی یا غم کی

فضا حاوی نہیں ہے بلکہ اس کا ازالہ بھی کیا ہے اور ان پریشانیوں اور غموں کا مداوا بھی پیش کیا، کچھ نظموں میں مایوسی کا عکس نظر ضرور آتا ہے لیکن یہ عکس ہمیشہ رہنے والا نہیں ہوتا بلکہ آخر میں وہ حرکت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مایوسی اکثر اس وقت جڑ پکڑتی ہے جب ہم غیر ضروری طور پر طاقت کی طرف دیکھتے ہیں اور اس طرف سے کسی طرح کی توقع رکھتے ہیں۔ جبکہ امید کو تلاش نہیں کیا جاتا صرف دل میں رکھا جاتا ہے اور ذہن میں ننھے بیج کی طرح ہوتی ہے۔ چند دنوں میں بیج زمین سے باہر تو آ جاتا ہے مگر اسے تناور درخت بننے میں ایک عرصہ لگ جاتا ہے مگر درخت بنتا ضرور ہے۔

ندا فاضلی کی ایک نظم ''اپنا دائرہ'' ایک منفرد نظم میں جس میں انسان کو اپنی حد تک کوئی کام کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔ نظم ملاحظہ ہو۔

تم!
انہیں روک تو نہیں سکتے

جو!
اجالوں کو کالا کرتے ہیں
چھین کر جنگلوں سے
سانپوں کو
آستینوں میں پالا کرتے ہیں
اپنے گملوں میں
پیاسے پھولوں کو
تھوڑا
پانی پلا تو سکتے ہو
کسی بچے کی ڈور میں
الجھی
کوئی تتلی

چھڑا تو سکتے ہو
بجلی گھر کے درست ہونے تک
موم بتی
جلا تو سکتے ہو

کوئی بھی تخلیق کار ہو وہ اپنی تخلیق میں اپنا عکس ضرور چھوڑتا ہے۔ ہر انسان زیادہ سے زیادہ عرصے تک جینا چاہتا ہے لیکن موت کبھی کسی سے دوستی نہیں کرتی اور انسان کی زندگی ختم ہو جاتی ہے لیکن تخلیق کار مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے اور اسے زندہ رکھنے میں اس کی تخلیقات اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ بظاہر یہ نظم معمولی اور مختصر نظر آتی ہے مگر اس میں انہوں نے ایک سچے انسان کا عکس پیش کیا ہے۔ اس نظم کا حاصل یہ ہے کہ ہر انسان کو اپنی بساط کے مطابق کچھ نہ کچھ کام کرنا چاہیے۔ اگر ہم کسی برے کام کو ہوتے ہوئے روک نہیں سکتے تو کم سے کم اتنا تو ضرور کرنا چاہیئے جتنا ہم کر سکتے ہیں۔

حواشی

ا۔ انتساب شمارہ نمبر 22، ص:96

ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی
جس کو بھی دیکھنا ہو کئی بار دیکھنا
(ندا فاضلی)

باب سوم

ندا فاضلی کی دیگر نگارشات
مختصر تعارف

غزل

اب تک ہم نے ندا فاضلی کی سوانح، ان کی نظم نگاری اور اسلوب و زبان سے متعلق گفتگو کی۔ ندا فاضلی نے نظم سے اپنی شاعری کا آغاز کیا اور اسی میں انھوں نے کمال حاصل کیا۔ نظم کے علاوہ انھوں نے غزل، گیت، دوہے اور ماہیئے میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی اپنی تخلیقات پیش کی ہیں۔ ان کی کتاب ''ملاقاتیں'' اپنے انداز کی ایک الگ کتاب ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے دو سوانحی ناول بھی لکھے، ترجمے بھی کیے۔ اب ہم یہاں ان کی غزل سے متعلق گفتگو کریں گے۔

ندا فاضلی کی غزلیہ شاعری پر تفہیمی تناظر اور نئے نہج سے نظر ڈالیں تو اس میں بہت سی معنوی خوبیاں نظر آئیں گی۔ احساس اور اظہار دونوں ہی سطحوں پر ندا فاضلی کے کلام میں جدت اور ندرت ہے، اشعار میں سادگی، سلاست اور نفاست کی کیفیت کارفرما ہے۔ نظموں میں ہندوستانی تہذیب، گاؤں دیہات کا تصور، اخلاقی قدریں، پائمال ہوتے رشتے، انسان کا ذہنی انتشار اور اس کے علاوہ آفاقی منظر نامہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے غزل میں بھی اپنی اسی روش کو برقرار رکھا ہے جس میں زندگی کے تمام چھوٹے بڑے حادثات ہیں۔ بقول ندا فاضلی زندہ ادب زندگی کی چہل پہل سے کٹ کر نہ کبھی زندہ رہا اور نہ زندہ رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے غزل میں بھی اپنی اسی انفرادیت کو جاری وساری رکھتے ہوئے اپنا مقام حاصل کیا ہے۔ ان کی غزلوں میں بھی

وہی موضوعات ہیں جو انھوں نے اپنی نظموں میں پیش کیے ہیں۔ ان کی بہت سی غزلیں ایسی ہیں جن کے اشعار زبان زد خاص عام ہیں۔ آسان اور سادہ الفاظ جو ہم روزمرہ کی زندگی میں استعمال کرتے ہیں۔ جب بھی کسی کے سامنے ندا فاضلی کا نام آتا ہے تو اس کے ذہن میں فوراً ان کا یہ شعر آجاتا ہے۔

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کہیں زمیں تو کہیں آسماں نہیں ملتا

یوں تو اس غزل کے سبھی اشعار مشہور ہیں لیکن اس شعر میں اتنی آفاقیت ہے کہ وہ بے ساختہ ہر زبان پر آجاتا ہے اور اس شعر میں انسان کی زندگی کی سچائی چھپی ہوئی ہے، جب انسان کسی کام میں کوشش کے باوجود بھی ناکام ہو جاتا ہے تو وہ اسی شعر کا سہارا لیتا ہے۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ انسان اپنی زندگی میں کچھ بھی کر لے لیکن اس کی خواہشات کبھی پوری نہیں ہوتیں۔ غالب نے تقریباً اس مضمون کو اس طرح پیش کیا ہے:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ندا فاضلی کا مذکورہ شعر جو بھی پڑھتا ہے یا سنتا ہے اسے اس میں اپنی زندگی کی کہانی نظر آتی ہے۔ یہی شعر ندا فاضلی کی قبر کے کتبے پر لکھا ہوا ہے۔ انسان جو بھی خواہش کرتا ہے اسے اس کے مطابق نہیں ملتا اور یہی محرومی اسے شاکی بنا دیتی ہے۔

انھوں نے اکثر ایسی غزلیں لکھی ہیں جن میں خیال کا تسلسل ملتا ہے اور اسی تسلسل کی وجہ سے ان کی اس طرح کی غزلوں پر نظم کا سا گمان ہوتا ہے۔ اسی طرح کی ایک غزل کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے جس میں انھوں نے انسان کی مصروف زندگی اور اس کے ذہنی انتشار کو پیش کیا ہے، اس کا مطلع ہے:

ہر طرف ہر جگہ بے شمار آدمی
پھر بھی تنہائیوں کا شکار آدمی

اس غزل کو اگر ہم عالمی تناظر میں رکھ کر دیکھیں تو یہ وہ دور ہے جس میں ہم او

رآپ سانس لے رہے ہیں اور اسے مشینی دور سے تعبیر کیا جائے تو بے جانہ ہوگا۔ مشین انسانی دماغ کی ایسی دریافت ہے جس نے انسانی سماج میں ترقی اور اشیاء میں تغیرات کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری کر دیا ہے۔ جدید ٹکنالوجی کے ذریعہ انسان اپنے رہن سہن، مکانات اور کاروباری مراکز حتیٰ کہ اپنے جسم کی زیب و زینت میں بھی نئی نئی تبدیلیاں کرتا رہا ہے۔ کوئی کمپنی جب اپنا پروڈکٹ بازار میں لاتی ہے تو اسے نئے سانچے میں ڈھال کر پیش کرتی ہے تاکہ پروڈکٹ خریدار کی توجہ کا مرکز بنے۔ جدت پسندی کی اس ہوا نے انسانی فکر کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ کپڑوں کی تراش خراش، مکانات کی تعمیر اور انسان کے استعمال میں آنے والی تمام اشیاء اس بات کا بین ثبوت ہیں۔ جس انسان کے پاس جتنے ذرائع موجود ہیں وہ اتنا ہی اپنے آپ کو منفرد بنانے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ اس جدت پسندی کا نتیجہ ہے کہ آج ایک فنکار بھی اپنی تخلیقات کو جدید سے جدید سانچے میں ڈھال کر عوام کے سامنے پیش کرنے کی جستجو میں رہتا ہے۔

ندا فاضلی نے اپنی اس غزل میں لب ولہجہ، اسلوب، انداز بیان، ردیف وقوافی کے ساتھ ساتھ الفاظ کے انتخاب میں بھی انفرادیت کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔

ندافاضلی نے عالمی سطح پر عصری حسیت کی بھی بہترین عکاسی کی ہے۔ آج جس طرح سے دنیا کے کچھ ممالک اپنی طاقت بڑھانے کے لیے انسانی زندگی کو کچلتے جا رہے ہیں، اس سے تمام اخلاقی قدریں پامال ہو رہی ہیں اور انھیں اس کا احساس بھی نہیں ہے۔ ندا فاضلی نے غزلوں میں قدیم لب ولہجہ اور فکر سے انحراف کر کے اپنے عہد کے تمام پیچیدہ مسائل، انسانی نفسیات اور فکر کی وسعتوں کو بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے وہ غزلوں میں گل و بلبل کی بزم طرب نہیں سجاتے بلکہ ان تمام مسائل کا احاطہ کرتے ہیں جو انسان کے سامنے ایک طرح کا چیلنج بن کر ابھرتے ہیں۔

آج سائنس جس رفتار سے ترقی کر رہی ہے اور روز بہ روز نئے تجربہ او رایجادات ہو رہی ہیں، انسان آسمانوں کی پیمائش کرنے میں مصروف ہے۔ اسی جدو جہد کو ندا فاضلی نے اپنی غزلوں اور نظموں میں خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان

کی غزلوں میں رومانی اشعار کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔

دوران مطالعہ ہمیں یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ ان کے شعر کہنے کا انداز بالکل مختلف ہے۔ وہ مضمون کو اشعار میں بڑی سادگی کے ساتھ پیش کرتے ہیں جس سے ان کا کلام قاری کے ذہن پر ایک نقش چھوڑ جاتا ہے۔ ندا کی یہی جدت طرازی انھیں منفرد بناتی ہے۔ انہوں نے ''عالمی گاؤں'' کا تصور بھی بڑی عمدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں آرام و آسائش کا ہر سامان موجود ہے مگر دلی سکون حاصل کرنے کے لیے انسان بے چین ہے۔ اس دور کا انسان بظاہر ایک دوسرے کے بہت قریب ہے۔ مگر حقیقت میں انسان قریب ہونے کے باوجود بہت دور ہو چکا ہے۔ اس کی وجہ سے اپنوں کی پہچان اور اپنائیت کا احساس مٹتا جا رہا ہے یا مٹ چکا ہے اور انسان بھیڑ میں ہوتے ہوئے بھی خود کو اکیلا محسوس کر رہا ہے۔ اسے اپنے سوا کسی کے بارے میں سوچنے کی نہ فرصت ہے اور نہ ہی وہ سوچنا چاہتا ہے۔ خاندانی تہذیب سب درہم برہم ہوگئی ہے۔ اشتراکی زندگی کی جگہ انفرادی زندگی نے لے لی ہے اور انسان کے پیشِ نظر اپنے ہی اغراض و مقاصد ہوتے ہیں۔ اس سے انسانی زندگی ایک نوحہ اور المیہ بن کر رہ گئی ہے۔ اسی نوحے، مرثیے کی ترجمانی ندا فاضلی نے اپنی غزلوں میں یا نظموں میں کی ہے خاص طور پر زیر مطالعہ غزل میں اسے بڑی فنکاری کے ساتھ برتا گیا ہے۔

آج انسان کو کسی اور شے سے خطرہ نہیں ہے بلکہ وہ ہر وقت اور ہر جگہ انسان سے ہی خطرہ محسوس کرتا ہے۔ ہتھیاروں کی اس دنیا میں وہ انسان ہی ہے جو صرف ایک لمحے میں انسانوں کو موت کی نیند سلا دیتا ہے۔ اس کی مثالیں تو بہت ہیں جیسے امریکہ نے 4/ اگست 1945 کو جاپان کے ترقی یافتہ شہر ہیروشیما پر ایٹم بم گرا کر اور اس کے تین دن کے بعد جاپان کے دوسرے شہر ناگاساکی پر دوسرا بم گرا کر لاکھوں بے گناہ انسانوں کو موت کے گڈھے میں ڈال دیا۔ اور اس سے زیادہ خطرناک یہ مرحلہ تھا کہ بموں کے گرانے کے بعد سالوں سال تک انسانوں کا معذور ہونا جاری رہا۔ اس منظر کو سمجھنے کے لیے ندا فاضلی نے اپنی غزل کو جن الفاظ کا جامہ پہنایا ہے وہ واقعی مناسب ہے۔ اس

ایک شعر میں ندا فاضلی نے عالمی منظر نامے میں ہونے والی قتل و غارت گری کو کس طرح پیش کیا ہے ملاحظہ ہو:

ہر طرف بھاگتے دوڑتے راستے
ہر طرف آدمی کا شکار آدمی

یہ بھی سچائی کسی سے چھپی نہیں ہے کہ آج کا انسان شام ہونے کے ساتھ اگلی صبح کے لیے انتظار میں نہیں رہتا، پتہ نہیں کل اسے میسر ہو بھی یا نہ ہو۔ اس شعر کو ملاحظہ کریں:

روز جیتا ہوا روز مرتا ہوا
ہر نئے دن نیا انتظار آدمی

چاروں طرف آدمی پریشان حال گھومتا پھرتا ہے مگر شام کو پھر مایوسی ہی اس کے ہاتھ لگتی ہے۔ دن بھر کتنے حادثات سے دوچار ہو کر اور دھکے کھا کر وہ واپس گھر آتا ہے اور اگلے دن کا انتظار نئے سرے سے کرتا ہے۔ یہی اس کا معمول بن گیا ہے۔ اس غزل کے آخری شعر میں ندا فاضلی نے پوری غزل کا لبِ لباب پیش کیا ہے:

زندگی کا مقدر سفر در سفر
آخری سانس تک بیقرار آدمی

یعنی انسان تمام عمر سفر میں رہتا ہے اور رہے بھی کیوں نا کہ دنیا کو ایک مسافر خانہ کہا گیا ہے۔ اگر آج کسی کام کو کرنے کا بیڑا اس نے اٹھایا اور وہ مکمل بھی ہو گیا تو اب اس کے ذہن میں کوئی دوسرا کام پھر ابھرنے لگتا ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاتا ہے کہ انسان کی خواہشات کی تکمیل کبھی نہیں ہوتی، وہ اپنی خواہشات کی تکمیل میں ہی تمام عمر سرگرداں رہتا ہے۔ آدمی کو اس سے کبھی فرصت ہی نہیں ملتی۔ وہ ہر وقت بے چین، بے قراری کی حالت میں رہتا ہے۔ زندگی کے اصل مشغلے کو ندا فاضلی نے بہت ہی مختصر اور سادہ الفاظ میں بیان کیا ہے۔

انتشار کو مختلف شعراء نے مختلف انداز میں برتا ہے۔ ہر دور میں انسان کسی نہ کسی پریشانی کا شکار ہو کر انتشار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسی انتشار کو شکیب جلالی نے

اپنے اس شعر میں اس طرح پیش کیا ہے:

ذرہ ذرہ شکیب ہے بے چین
قلب کا انتشار ہے دنیا

ندا فاضلی نے اس غزل میں بالکل سادہ الفاظ کو نئے مفاہیم کے ساتھ جیسے ''تنہائیوں کا شکار''، 'بوجھ ڈھوتا ہوا'، 'بھاگتے دوڑتے راستے'، 'روز جیتا ہوا'، 'روز مرتا ہوا'، 'گھر کی دہلیز'، کاروبار'، 'آخری سانس'، پیش کر کے غزل کو آفاقیت بخشی ہے۔ یہ اشعار بالکل عام فہم ہیں جنھیں سمجھنے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوتی موضوع بھی ایسا ہے کہ ہر انسان کا اس سے واسطہ ہے۔ یہی ندرتِ الفاظ اور سادہ اسلوب ان کو انفرادیت بخشتا ہے۔ انھوں نے اس غزل میں ان بھی مسائل کا احاطہ کیا ہے جو یا تو ان کے ساتھ رونما ہوئے یا پھر انھوں نے دیکھے۔ انھوں نے ان مسائل کو مصنوعی پیکر میں نہیں ڈھالا بلکہ انھیں جوں کا توں پیش کر دیا ہے۔ یہی طرزِ ادا انھیں منفرد بناتی ہے۔ ان کی غزلوں میں وہ تمام عصری مسائل ابھر کر سامنے آتے ہیں جن کا رشتہ کبھی نہ کبھی انسان سے رہا ہوتا ہے اور یہ عصری مسائل خواب کی دنیا سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ ان کا تعلق حقیقت سے ہوتا ہے۔

لفظ ''گھر'' ان کی نظموں اور غزلوں میں گردش کرتا رہتا ہے ''گھر'' کو انھوں نے طرح طرح سے اپنی شاعری میں برتا ہے اور ان کی غزلوں میں 'گھر' سے متعلق اشعار کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔ 'گھر' کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے چند اشعار ملاحظہ ہو:

رہتا نہیں ہے کچھ بھی سدا ایک سا یہاں
دروازہ گھر کا کھول کے پھر گھر تلاش کر

اس کو رخصت تو کیا تھا مجھے معلوم نہ تھا
سارا گھر لے گیا گھر چھوڑ کے جانے والا

لڑ رہے ہیں اس کے گھر کی چار دیواری پہ سب
بولیے رے داس جی جوتا کہاں گانٹھا گیا

نئے مکان کا نقشہ ہے زیر غور ابھی
جو کھو چکا ہے وہ گھر بھی خیال میں رکھیے

خدا کے گھر تو کئی ہیں عبادتوں کے لیے
دلوں کی راہ گذر بھی خیال میں رکھیے

نیلے پیلے ہرے گلابی سارے رنگ اسی کے ہیں
ایک ہی دنیا سب کو اپنے گھر کے جیسی لگتی ہے

گھر سے باہر نہیں ہوتی کسی دشمن کی تلاش
اپنے ہی آپ سے ٹکراتا ہے غصہ سب کا

شہر میں کس کس سے لیتے انتقام
گھر میں آئے سب سے پہلے سو گئے

دل تھا حساس بہت زیروزبر سے گزرا
جو بھی طوفاں اٹھا پہلے میرے گھر سے گزرا

شہر تو بعد میں ویران ہوا
میرا گھر خاک ہوا تھا پہلے

تم جو سوچو وہ تم جانو ہم تو اپنی کہتے ہیں
دیر نہ کرنا گھر جانے میں ورنہ گھر کھو جائیں گے

ان اشعار کے علاوہ بھی بہت سے ایسے اشعار ہیں جن میں ندا فاضلی نے 'گھر' کا استعمال کر کے اپنے ماضی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ گھر سے بے گھر ہونے، دردر بھٹکنے اور پھر اپنا گھر آباد کرنے میں انھیں جن پریشانیوں کا سامنا ہوا ہے، انھیں اپنے اشعار میں پیش کیا ہے۔ انھیں گھر سے بہت محبت تھی۔ وہ جب گوالیار میں تھے تو ان کے گھر کے تمام افراد ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے ان کا جو گھر تھا وہ ان کے گھر والوں نے فروخت کر دیا تھا۔ جب ندا فاضلی شام کو گھر واپس آئے تو انھیں اپنا گھر نہ ملا۔ وہ گھر میں ہو کر بھی بے گھر ہو چکے تھے۔ اس صدمے نے انھیں بہت تکلیف پہنچائی اور اس کا درد ان کے دل میں آخر تک رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ''گھر'' نے ان کی شاعری میں گھر کر لیا ہے۔

ان کی غزلوں میں ہندی شاعری اور الفاظ کا اثر واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہی ان کی وہ پہچان ہے جو دوسرے جدید شعراء سے منفرد بناتی ہے۔ انھوں نے ہندی شعر و ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا کیونکہ وہ گوالیار میں اپنے ابتدائی دنوں میں جس حلقے میں رہے وہ ہندی ادیبوں اور شاعروں کا ہی حلقہ تھا، اسی کے زیر اثر انھوں نے اپنے کلام میں ہندی کا اثر لیا۔ ندا فاضلی کی غزل گوئی سے متعلق سیفی سرونجی کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''سچ تو یہ ہے کہ ندا فاضلی نے اپنی شاعری میں اردو غزل کو نہ صرف نیا لہجہ دیا، بلکہ غزل کو فکر و معنی کے وہ گوہر عطا کیے ہیں کہ ندا فاضلی کو آج کا غالب کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا''۔[1]

اس اقتباس میں ظاہر ہے ڈاکٹر سیفی سرونجی نے مبالغہ سے کام لیا ہے۔ ندا فاضلی کو ہم کسی بھی زاویے سے آج کا غالب نہیں کہہ سکتے۔ ان کی شاعری میں کوئی بھی ایسی صفت

نہیں جو یہ ثابت کرے کہ ندا فاضلی کے کلام میں غالب جیسی معنی آفرینی، اسلوب بیان، ندرت الفاظ، ظرافت، خیال بندی یا کوئی اور خوبی ہے۔ ہاں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے ہمعصروں میں اپنا اسلوب سب سے جدا رکھا اور ایسے الفاظ کا انتخاب کیا جو سادہ ہونے کے ساتھ عام فہم بھی تھے۔ ان کے اسی اسلوب نے انھیں منفرد مقام بخشا۔ شہر کی زندگی اور اس میں زندگی کے لیے جد و جہد، جب کوئی کسی کا سہارا نہیں ہوتا نہ شہر میں رہنے کی جگہ اور نہ کوئی ہمدرد، اور ہمیں آگے بھی بڑھنا ہوتا ہے تو کیا جذبات ہوتے ہیں، ندا کہتے ہیں:

یہاں کسی کو کوئی راستہ نہیں دیتا
مجھے گرا کے اگر تم سنبھل سکو تو چلو

شہروں میں آدمی کس طرح ترقی کرتے ہیں اس ایک شعر سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ندا فاضلی کو بھی بمبئی میں آکر بہت جد و جہد کرنی پڑی تھی اور یہ شعر ان کے اسی تجربے کی نشاندہی کرتا ہے۔

ندا فاضلی کو چھوٹے بچوں سے بہت پیار رہا ہے۔ اس پیار کو انھوں نے نظموں میں بھی پیش کیا ہے اور غزلوں میں بھی۔ وہ بچوں کے اندر خدا کو دیکھتے ہیں اور ان کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان کو ایک دوسرے کا دکھ درد سمجھنا اور اس کا اپنی حد تک مداوا کرنا ہی سب سے بڑی عبادت ہے۔ بچوں کے اندر تو خاص طور پر خدا کا جلوہ تلاش کرتے ہیں۔ اسی سے متعلق ایک شعر ملاحظہ ہو:

مسجدوں میں سجدوں کی مشعلیں ہوئیں روشن
بے چراغ گلیوں میں کھیلتا خدا دیکھوں

یا پھر ان کا یہ مشہور زمانہ شعر توجہ کا مرکز رہا کہ:

گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں کر لیں
کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

یہ شعر ادبی حلقوں میں بہت موضوع گفتگو رہا ہے۔ اس شعر کے دو پہلو ہو سکتے ہیں

ایک تو مثبت اور دوسرا منفی۔ مثبت اس لیے کہ اگر کسی غریب کا بچہ بھوک کی وجہ سے رو رہا ہے اور وقت نماز کا ہو رہا ہے تو انسان کو چاہئے کہ پہلے اس بچے کی بھوک مٹائے، یعنی اسے ہنسائے، پھر نماز پڑھنے کے لیے جائے۔ دوسرا پہلو اس شعر کا یہ ہے کہ مذہب سے فرار کی کیفیت ہے۔ اگر مسجد بہت دور ہے تو کیا؟ نماز گھر میں بھی تو پڑھی جا سکتی ہے۔ اس روتے ہوئے بچے کو بھی ہنسایا جا سکتا ہے، وقت بھی زیادہ ضائع نہیں ہوگا اور دونوں کام ہو جائیں گے۔

ندا فاضلی نے غزلوں میں جس طرح کے موضوع برتے ہیں وہ نیا روپ لئے ہوئے ہیں۔ غزلوں میں اس طرح کے موضوع کا انتخاب کسی اور شاعر کے یہاں نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ ندا فاضلی نے حسن و عشق کے موضوع کو بھی غزلوں میں پیش کیا ہے۔ حسن و عشق ہی اصل میں غزل کی پہچان ہے، لیکن یہاں بھی انھوں نے اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے اردو غزل کو وسعت عطا کی۔

آنکھ کو جام لکھو زلف کو برسات لکھو
جس سے ناراض ہو اس شخص کی ہر بات لکھو

جس سے مل کے بھی نہ ملنے کی کسک باقی ہے
اسی انجان شناسا کی ملاقات لکھو

جسم مسجد کی طرح، آنکھیں نمازوں جیسی
جب گناہوں میں عبادت تھی وہ دن رات لکھو

غزل کے ان اشعار میں حسن و عشق اور رومان کی آمیزش سے ایک پُر لطف فضا قائم ہوئی ہے۔ اس طرح کی فضا کا ان کے معاصرین شعرا کے کلام میں فقدان ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ کیجئے:

جب بھی کسی نگاہ نے موسم سجائے ہیں
تیرے لبوں کے پھول بہت یاد آئے ہیں

رشتوں کے نام وقت کے چہرے بدل گئے
اب کیا بتائیں کس کو کہاں چھوڑ آئے ہیں

موسم کہاں مانتا ہے تہذیب کی بندشوں کو
جسموں سے باہر نکل کر انگڑائیاں بولتی ہیں

ندا فاضلی کا ایک شعری مجموعہ ''زندگی کی طرف'' ہے جو ''زندگی کی تڑپ'' کے نام سے غلطی سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں 15 نظمیں اور 31 غزلیں ہیں۔ ان میں سبھی غزلیں اساتذہ کی زمینوں میں کہی گئی ہیں۔ جیسے امیر خسرو، کبیر داس، قلی قطب شاہ، نصرتی، ولی دکنی، سودا، میر، نظیر، ناسخ، درد، رند، یقین، مومن، غالب وغیرہ۔ کچھ غزلوں سے اشعار اور جس شاعر کے زمین میں غزل کہی گئی ہے اس کا مصرع ملاحظہ کیجیے۔

کوشش بھی کر، امید بھی رکھ، راستہ بھی چن
پھر اس کے بعد تھوڑا مقدر تلاش کر

(دل ہے تو دل کے واسطے دلبر تلاش کر) (دعا ڈبائیوی کی زمین میں کہی گئی غزل)

جس کو بھی دیکھئے وہ سند یافتہ ہے آج
اب مکتبوں میں ہوتے نہیں امتحان کیا

(تجھ حسن سوں عروس بنی سب جہان کیا) (نصرتی کی زمین میں کہی گئی غزل)

کہتا ہے کوئی کچھ تو سمجھتا ہے کوئی کچھ
لفظوں سے جدا ہو گئے لفظوں کے معانی

(یہ رام کہانی ہے نہ آرام کہانی) (قاضی محمود بحری کی زمین میں کہی گئی غزل)

چھ دن لگا کے اس نے سارا جہاں بنایا
تجھ جیسا اور کوئی پھر بھی کہاں بنایا

(جس نے قدم اٹھایا اس نے نشاں بنایا) (سودا کی زمین میں کہی گئی غزل)

کسی گھر کے، کسی بجھتے ہوئے چولہے میں ڈھونڈ اس کو
جو چوٹی اور داڑھی تک رہے وہ دین داری کیا

ہمارا میرؔ جی سے متفق ہونا ہے ناممکن
اٹھانا ہے جو پتھر عشق کا تو ہلکا بھاری کیا

(ہمن ہے عشق مستانہ ہمن کو ہوشیاری کیا) (کبیر داس کی زمین کہی گئی غزل)

کیا ہوا جو اٹھ گئے سارے طبیبوں کے مطب
درد کے اندر ہی پوشیدہ ہے درماں غم نہ کھا

(یوسفِ گم سو پھر آ گا اب بہ کنعاں غم نہ کھا) (قلی قطب شاہ کی زمین میں کہی گئی غزل)

کل بہتر تھے مگر ہے آج لاکھوں کا شمار
ہر طرف اب کربلا ہے کربلا کے سامنے

(آشنا کا کیا گلہ نا آشنا کے سامنے) (ناسخ کی زمین میں کہی گئی غزل)

ندا فاضلی کا طرزِ بیان اور اسلوب بالکل جداگانہ ہے۔ خوش ترکیبی کا سلیقہ ندا فاضلی کی کہانی بیان کر رہا ہے بات چاہے اسلوب کی ہو یا خیال کی، موضوع کی ہو، یا ہیئت کی، ندا فاضلی کی شاعری سب جگہ متوازن اور تخلیقی اعتبار سے بھر پور ہے ان کی شاعری میں پُر اسراریت اور ابہامیت کو دخل نہیں جس کے سبب ان کی شاعری ایک منفرد لب ولہجہ کی حامل بن گئی ہے۔ ان کی غزلیں خوبصورت پیکر، اور کہکشاں کی مانند دلکش البم نظر آتی ہیں۔ دراصل ان کا تجربہ اور مشاہدہ حقیقت پر مبنی ہے۔ اسی لئے انہوں نے غزل کو بے تکلفی سے اپنے اظہار کا ایک وسیلہ بنایا ہے جس سے ان کے لب ولہجہ میں ایک طرح کی شیرینی پیدا ہوگئی ہے۔ بقول پروفیسر ظہیر علی:

''ندا فاضلی غزل کی روایتی پرداخت کے باوجود اس سخت جان کا فرادا صنف سخن کے حمایتی ہیں۔ وہ اس کے فارم میں اصلاح یا تبدیلی کے داعی بھی نہیں ہیں۔ اسی

سبب انہوں نے کبھی آزاد غزل کہنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ انہوں نے غزل کی ہیئت کا احترام کرتے ہوئے وسعتِ مضامین اور نئی لفظیات (اردو میں عام طور پر غیر مستعمل ڈکشن) کے ذریعے اپنی غزل کی شناخت قائم کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ اپنی اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ ان کی اکثر غزلیں بحر، ردیف، قافیہ، مطلع غرض، صنفِ غزل کی تمام پابندیوں کو نباہنے کے باوجود اردو کی روایتی غزل سے مختلف ہیں۔ ان کی غزلوں کی تازہ کاری کا سبب بڑی حد تک ان کی لفظیات میں پوشیدہ ہے۔'' (اعتراف۔ندا فاضلی نمبر صفحہ۔۱۱۹)

کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

محبت نظر باندھ دیتی ہے ورنہ
حسیں سے بہت دل لگانے کے قابل

ہنسی آج آتی ہے ان حادثوں پر
جو کل تک تھے رونے رلانے کے قابل

باغ ہے دل فریب دونوں سے
پھول کو خار سے جدا مت کر

ایک کے بعد ایک دور نیا
یوں ہی تاریخ لکھی جاتی ہے

مجھے بانٹا گیا کچھ اس طرح سے
مرے منہ میں نہیں میری زباں تک

یا پھر یہ شعر دیکھئے۔

ہماری بستیوں کے قصہ گو گم ہو گئے شاید
زمیں پر اب فلک سے کوئی افسانہ نہیں آتا

یہ وہ اشعار ہیں جن میں زندگی کی حقیقت کو پیش کیا گیا ہے۔ وہ مختلف سطحوں پر نئے نئے میدان فتح کرتے گئے اور فکری اور تخلیقی سطح پر آگے بڑھتے رہے۔ اُن کے اشعار کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ سیدھے طور پر قاری کے دل میں اُتر جاتے ہیں یعنی از دل خیزد بر دل ریزد۔

غزل کا ایک شعر مکمل اکائی ہوتا ہے۔ اس میں کسی کہانی کو بھی پیش کیا جا سکتا ہے اور یہی بڑی شاعری ہونے کی دلیل ہے۔ ندا فاضلی نے اپنی شاعری میں کسی کی تقلید نہیں کی بلکہ اپنا راستہ خود بنایا اور اس میں انفرادیت بھی قائم کی۔ شاعری سے متعلق ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا یہ اقتباس پیش ہے۔

> ''ہر بڑی شاعری دراصل اپنا پیمانہ خود ہوتی ہے۔ بڑا شاعر یا تو کسی روایت کا خاتمہ ہوتا ہے یا کسی طرزِ نو کا موجد، وہ بہر حال باغی ہوتا ہے۔ فرسودہ روایات پر کاری ضرب لگاتا ہے، اظہار کے لئے نئے پیمانے تلاشتا ہے اور نئی شعری گرامر خلق کرتا ہے، وہ یا تو اپنے زمانے سے آگے ہوتا ہے یا اپنے عہد کے درد و داغ و سوز و ساز و جستجو و آرزو کی ایسی ترجمانی کرتا ہے کہ اپنے وقت کی آواز بن جاتا ہے۔'' (ترقی پسند، جدیدیت، مابعد جدیدیت، ص ۱۶۲)

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا یہ اقتباس ندا فاضلی کے فکر و شعور پر منطبق ہوتا ہے۔ ندا

فاضلی کا سب سے بڑا وصف ان کی طبع سلیم ہے جس کی بدولت انہوں نے محنت و مجاولت اور ریاضت سے اپنے لب و لہجے اور اسلوب کی پرورش کی ہے۔ اب یہ اشعار دیکھیے جن میں ایک الگ دنیا بسی ہوئی ہے۔

کبھی مجھے بھی تھا یاروں سے اختلاف بہت
ہر ایک بات پہ اب سر جھکائے رہتا ہوں

کہیں ملے کوئی اپنا تو پھوٹ کر رولوں
کئی دنوں سے بہت مسکرا رہا ہوں میں

نیل گگن میں تیر رہا ہے اُجلا اُجلا پورا چاند
کن آنکھوں سے دیکھا جائے چنچل چہرا جیسا چاند

میداں کی ہار جیت تو قسمت کی بات ہے
ٹوٹی ہے کس کے ہاتھ میں تلوار دیکھنا

مجھے یہ کہنے میں تامل ہے کہ اشعار سے کسی شاعر کے دروں کی عکاسی ہوتی ہے۔ میرے خیال میں شاعر کے اشعار یا خیال کو اس کے جذباتیت سے متعلق سمجھ لینا صحیح نہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ غزل کا کوئی ایسا قافیہ بھی مل جاتا ہے جو شاعر کو ایسا مضمون غزل میں باندھنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ شاعر کو جس کا تجربہ بھی نہیں رہا ہو۔ لیکن ندا فاضلی کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے جو بھی مضامین اپنی غزلوں میں پیش کیے ہیں ان کا تعلق ندا فاضلی کی ذاتی زندگی کے تجربوں سے ضرور رہا ہے۔ انہوں نے قدیم روایت کو توڑا نہیں ہے بلکہ اس میں جدید دور کے شعری تقاضوں کی آمیزش کی ہے۔ اُن کے اشعار میں اُن کی آپ بیتی نظر آتی ہے تجربہ اگر نہ ہو تو شاعری شاعری نہیں رہتی۔ تجربے ہی کی بنا پر شعر میں آفاقیت پیدا ہوتی ہے۔ بقول کلیم الدین احمد۔

''شاعری اچھے اور بیش قیمت تجربوں کا حسین مکمل اور موزوں بیان ہے۔ خیال بھی تجربہ ہے اور جذبہ بھی تجربہ ہے، پھول کی خوشبو، ٹائپ رائٹر کی آواز، اقلیدس کا مطالعہ، کسی پر عاشق ہونا بھی تجربہ ہیں اور شاعری کا تجربوں کی دنیا پر قبضہ ہے۔'' (عملی تنقید۔ کلیم الدین احمد، ص:۲۲۱)

مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ کیجئے:

اچھی نہیں ہے شہر کے رستوں سے دوستی
آنگن میں پھیل جائے نہ بازار دیکھنا

اپنی مرضی سے کہاں اپنے سفر کے ہم ہیں
رخ ہواؤں کا جدھر کا ہے ادھر کے ہم ہیں

قلم ہاتھ میں ہے لکھوں تو لکھوں کیا
نہیں مانتا دل دھڑکتا بہت ہے

دیکھا ہوا سا کچھ ہے تو سوچا ہوا سا کچھ
ہر وقت میرے ساتھ ہے الجھا ہوا سا کچھ

یا پھر یہ شعر دیکھئے:

پتھروں میں بھی زباں ہوتی ہے دل ہوتے ہیں
اپنے گھر کے در و دیوار سجا کر دیکھو

ندا فاضلی نے روایتی شاعری نہیں کی انہوں نے اپنے ذوق سخن کے سبب جدیدیت سے استفادہ کر کے اپنے افکار کو شعری جامہ پہنایا ہے حالانکہ ان کی غزلیں علامتی طرز اظہار سے مبرّا ہیں لیکن کہیں کہیں یہ عکس بھی نظر آجاتا ہے۔ انہوں نے جو بھی خیال اپنے اشعار میں

پیش کیا اس کے لئے براہِ راست طریقہ اختیار کیا ہے۔

میں موسموں کے جال میں جکڑا ہوا درخت
اگنے کے ساتھ ساتھ بکھر تا رہا ہوں میں

اوپر کے چہرے مہرے سے دھوکا نہ کھایئے
مجھ کو تلاش کیجئے، گم ہوگیا ہوں میں

غزل کے اشعار میں ندا فاضلی نے جو خیال پیش کیا ہے اسے اتنے سادہ طریقے سے نبھایا ہے کہ یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہم شعر پڑھ رہے ہیں کیونکہ ان کے خیال اکثر روزمرہ کی بات چیت سے اخذ ہیں لیکن ہم غور وفکر کریں تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس سادہ بیانی کے پیچھے کوئی تجربہ ضرور ہے۔ ایسی شاعری بہت مشکل ہوجاتی ہے جب کسی ایسے خیال کو شعر میں پیش کرنا ہو جو ہر عام آدمی کی زندگی سے جڑا ہو۔

اکثر پہاڑ سر پہ گرے اور چپ رہے
یوں بھی ہوا کہ پتہ ہلا دل دہل گیا
کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کہیں زمیں تو کہیں آسماں نہیں ملتا

دیوار و در سے اتر کے پرچھائیاں بولتی ہیں
کوئی نہیں بولتا جب تنہائیاں بولتی ہیں

ندؔا فاضلی کے یہاں اس طرح کے اشعار کی تعداد زیادہ ہے جو اپنے اندر سماجی معنویت لئے ہوئے ہیں۔ اس طرح کے اشعار میں معاشرے کا ایک جائزہ بھی ہے، اور ہوتا بھی کیوں نہ کیونکہ ان کی شاعری حقیقت کی عکاس ہے۔ مندرجہ بالا اشعار میں دوسرا شعر ندا فاضلی کا بہت مشہور شعر ہے یہ شعر ان کی قبر کے کتبے پر بھی کندہ ہے۔ اب ذرا کیفی کے یہ شعر دیکھئے۔

میں ڈھونڈتا ہوں جسے وہ جہاں نہیں ملتا
نئی زمین نیا آسماں نہیں ملتا

یہ شعر کیفیات میں صفحہ 349 پر درج ہے اور چھ اشعار کی غزل ہے۔اس کے نیچے ستمبر 1974 کی تاریخ درج ہے۔جبکہ ندا فاضلی نے اپنی یہ غزل اس کے بہت بعد میں کہی ہے، ہوسکتا ہے ندا فاضلی کے سامنے کیفی اعظمی کی یہ غزل رہی ہو اور انہیں اس کی زمین پسند آگئی ہو۔اس غزل کے ایک دو اشعار کا خیال بھی دونوں کے یہاں مشترک ہے۔

ندا فاضلی کی شاعری میں تفکر ہے اور جب یہی تفکر جمالیاتی انبساط پیدا کرنے لگتا ہے تو شاعری اپنی معراج خود پالیتی ہے اور اسی نے ندا فاضلی کو انفرادیت بخشی ہے وہ فکر آمیز بات کو بہت ہی سادہ طریقے سے کہہ جاتے ہیں۔

صرف آنکھوں سے ہی دنیا نہیں دیکھی جاتی
دل کی دھڑکن کو بھی بینائی بنا کر دیکھو

یوں تو سب کی ہے ہم سفر دنیا
سب کی ہوتی نہیں مگر دنیا

کیسی مسجد کہاں کا بت خانہ
ہر جگہ اس کا آستانہ ہے

ندا فاضلی نے جدید غزل کی تشکیل میں اہم کردار نبھایا ہے وہ بلاشبہ اس دور کے اہم شاعر ہیں۔ان کی غزلوں میں آج کے دور کے انسان اور معاشرے کی حسیت اور اس کے ذہنی، نفسیاتی الجھاؤ کی عکاسی کی گئی ہے۔اس جدید دور کے پیدا شدہ مسائل سے انسانی ذہن انتشار کا شکار ہوا اور اسے چہار سمت حادثات ہی حادثات نظر آئے جس سے اس کے گرد فراریت، خوف، وحشت، بغاوت، اجنبیت، مایوسی اور اقدار کی پامالی کا غم

بن گیا۔ ان تمام باتوں کا اظہار جدید غزل کا موجب بنا۔ ندا فاضلی کے معاصرین نے بھی جدید غزل میں انہی مسائل کو پیش کیا۔ ان کے یہاں ندا فاضلی اور ان کے کچھ معاصرین کے چند اشعار پیش ہیں۔

ہر طرف سو چراغ جلتے ہیں
حادثے ساتھ ساتھ چلتے ہیں

(ندا فاضلی)

کھلی جو آنکھ تو کیا دیکھتا ہوں منظر میں
چہار سمت سمند رہے اور ششدر میں

(زیب غوری)

اس میں تو تم ہنستے ہو
یہ تصویر پرانی ہے

(محمد علوی)

ہے کب سے اس شہر کی جانب سفر اپنا
جس شہر کی جانب کوئی رستہ نہیں جاتا

(مخمور سعیدی)

ندا فاضلی نے اپنی شاعری کے ذریعے تمام عالم میں اپنی شاعرانہ صلاحیت کا لوہا منوایا ۔انہوں نے اعلیٰ شاعری اور معیاری نثری تخلیقات (منفرد اسلوب) سے اردو شعرو ادب میں اضافہ کیا۔ ان کے اندازِ فکر میں بھرپور ندرت اور جدت موجود ہے اور ساتھ ہی احساس کی شدت، فکر کی ندرت اور پیش کش کی جو دل پذیری ہے وہ بے مثال ہے۔

ہوش والوں کو خبر کیا بے خودی کیا چیز ہے
عشق کیجئے پھر سمجھئے زندگی کیا چیز ہے

کئی دن بعد دیکھا تھا مجھے میرے محلے نے
کھنڈر ہوتے کسی گھر سے کوئی صدمہ نکل آیا

خدا کی دنیا میں جینا بھی اک عبادت ہے
ہے کون اچھا برا یہ حساب رہنے دے

زمین والے نہیں سنتے جب زمینوں کی
زمین خود ہی نگل لیتی ہے زمینوں کو

ندؔا فاضلی کی غزلیہ شاعری پر تفہیمی تناظر اور نئے نہج سے نظر ڈالیں تو اس میں بہت سی معنوی خوبیاں نظر آئیگی۔احساس اور اظہار دونوں ہی سطحوں پر ندا فاضلی کے کلام میں جدت اور ندرت ہے اشعار میں سادگی سلاست اور نفاست کی کیفیت کارفرما ہے۔

پرانے گھر سے نئے گھر میں پھر سے بسنے کو
میں اپنے آپ سے باہر نکلتا رہتا ہوں

خوفِ شکست دستِ دعا بن کے رہ گیا
کمزوریوں کا نام خدا بن کے رہ گیا

ندا فاضلی کی غزلوں میں فکر واظہار کے معاملے میں خاصہ تنوع ہے جس کی وجہ سے ان کے اشعار میں تازگی پیدا ہوگئی ہے۔وہ کسی افسردہ خیال کو بھی اس طرح پیش کرتے ہیں کہ قرأت کے بعد کسی طرح کی منفی کیفیت کا اثر نہیں ہوتا اور اس مسئلے سے لڑنے کا نیا حوصلہ مل جاتا ہے اور یہ سب خیال کی پختگی، بیان کی برجستگی اور مشاہدہ کی وجہ سے ہے۔

اچھی تھی وہ کتاب عجب اتفاق ہے
پھر ہوگئی خراب عجب اتفاق ہے

ہونا تھا ختم جس جگہ قصہ کتاب کا
خالی وہی ہے باب عجب اتفاق ہے

جنت میں جس کے پینے پلانے کا حکم ہے
دنیا میں عذاب عجب اتفاق ہے

مندرجہ ذیل دو اشعار میں انہوں نے ایک مختلف کیفیت کی ترجمانی کی ہے۔

بھٹک رہا ہوں لیے تشنگی سمندر کی
مگر نصیب میں شبنم ہے کیا کیا جائے

ملی ہے زخموں کی سوغات جس کی محفل سے
اسی کے ہاتھ میں مرہم ہے کیا کیا جائے

مندرجہ بالا اشعار میں ندا فاضلی کی ذاتی کیفیات کی ترجمانی کا اثر صاف طور پر منعکس ہے باوجود مجبوری کے انہوں نے خودداری کا بہترین احساس، خود اعتمادی اور مخالف حالات کا ذکر اشعار میں پیش کر کے اپنے احساس شاعری کو روشن کیا ہے۔

ذیل میں چند متفرق اشعار ان متنوع کیفیات کی ترجمانی کے لئے ملاحظہ کیجیے۔

سکھا دیتی ہیں چلنا ٹھوکریں بھی راہ گیروں کو
کوئی رستہ سدا دشوار ہو ایسا نہیں ہوتا

تجھ کو تجھ میں ڈھونڈ کے ہم نے
دنیا تیری شان بڑھا دی

خدا کے حکم سے شیطان بھی ہے آدم بھی
وہ اپنا کام کرے گا تم اپنا کام کرو

کبھی کبھی کا یہ مل بیٹھنا غنیمت ہے
نئی لغت کے مطابق یہی محبت ہے

اس طرح کے اشعار میں ان کی ذاتی زندگی کے تجربات و مشاہدات کی بہترین عکاسی ہے۔ ان کی غزلوں میں ان متنوع کیفیات کی ترجمانی ملتی ہے جو انہیں اپنی زندگی اور ماحول سے ملیں۔ دراصل شاعری ندا فاضلی کی طبع موزونی کا معجزہ تھی اور اس کو جلا بخشنے کا کام ان کی بلند خیالی نے کیا۔ ان کے ذوق نے ان کے کلام کو آراستہ و پیراستہ کیا یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں سادگی پرکاری کے ساتھ معنویت و احساسات کی دبیز تہیں محسوس کی جاتی ہیں۔

خط کے آخر میں سبھی یوں ہی رقم کرتے ہیں
اس نے رسماً ہی لکھا ہوگا تمہارا اپنا

کتابیں یوں تو بہت سی ہیں میرے بارے میں
کبھی اکیلے میں خود کو بھی پڑھ لیا جائے

بول رہے ہیں کئی آدمی درندوں میں
مرض پرانا ہے اس کا نیا علاج بھی ہو

بھول تھی اپنی فرشتہ آدمی میں دیکھنا
آدمی میں آدمیت ہے چلو یونہی سہی

فرشتہ تو بہت آگے کا معاملہ ہے غالب نے یہاں تک کہہ دیا تھا ”آدمی کو

بھی میسر نہیں انساں ہوتا''۔

ندا فاضلی نے چھوٹی بحروں میں بہترین غزلیں کہی ہیں۔ ان غزلوں کے کچھ اشعار سہل ممتنع، مکالمہ کی خوبی لیے ہوئے ہیں اور ایک عجیب کیفیت کی عکاسی کرتے ہیں۔

چھوٹا لگتا تھا افسانہ
میں نے تیری بات بڑھا دی

کام تو ہیں زمیں پر بہت
آسماں پر خدا کس لیے؟

تم یہ کیسے جدا ہوگئے
ہر طرف ہر جگہ ہوگئے

جیسا جس کے یار کا چہرہ
ویسا ہی سنسار کا چہرہ

بے وفا تو نہ وہ ہیں نہ ہم
یوں ہوا بس جدا ہوگئے

اس طرح کے اشعار میں ان کے شعری رجحان کی بھرپور عکاسی ملتی ہے جس میں انہوں نے اپنے جذبے کو پوری شدت اور وضاحت سے پیش کیا ہے۔ اشعار میں تحیر کو ندرت کے ساتھ پیش کرنے سے ایک گہری معنویت پیدا ہوگئی ہے۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ ندا فاضلی نے شاعری میں اپنے ماحول کا منظرنامہ پیش کیا ہے۔

بڑے بڑے غم کھڑے ہوئے تھے رستہ روکے راہوں میں
چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے ہم نے دل کو شاد کیا

جب بھی کوئی تخت سجا ہے میرا تیرا خون بہا ہے
درباروں کی شان و شوکت میدانوں کی شمشیریں ہیں

قبر میں حق گوئی باہر منقبت قوّالیاں
آدمی کا آدمی ہونا تماشہ ہو گیا

عجیب دور ہے یہ طے شدہ نہیں کچھ بھی
نہ چاند شب میں نہ سورج سحر میں رہتا ہے

ندؔا فاضلی کی شاعری مختلف قسم کے موضوعات کا احاطہ کرتے ہوئے آج کے حالات پر بہترین تبصرہ ہے، اس تبصرہ میں ان کی فکر و آگہی اور جولانیٔ طبع نے جو جوہر دکھائے ہیں وہ واقعی قابلِ غور ہیں۔ وہ اپنے دور کے انتشار سے بہت متاثر ہوئے جس کی وجہ سے ان کی غزلوں میں مختلف عصری مسائل پر ایک طرح کا تبصرہ ہے۔ عصری مسائل نے انہیں مکمل طور پر ہلا کر رکھ دیا تھا۔ جس کے سبب ان کی غزلوں میں فکر و آگہی، خیال کی ندرت، تجربات و مشاہدات کا پرتو صاف طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے اپنے تجربات و مشاہدات کو ہندوستانی تہذیب سے ہم آہنگ کر کے ایک نیا تصور پیش کیا اور دوسرے شعراء کے مقابلے الگ انداز میں عوام کے سامنے پیش کیا۔ ان کی اسی انفرادیت کو وقت نے آہستہ آہستہ متعارف کرایا۔ یہ شعران کے تخلیقی رویے پر کس قدر صادق آتا ہے۔

شائستہ محفلوں کی فضاؤں میں زہر تھا
زندہ بچے ہیں ذہن کی آوارگی سے ہم

ایک غزل کا یہ انداز اور تیور دیکھیے۔

یہ جو پھیلا ہوا زمانہ ہے
اس کا رقبہ غریب خانہ ہے

کوئی منظر سدا نہیں رہتا
ہر تعلق مسافرانہ ہے

دیس پردیس کیا پرندوں کا
آب ودانہ ہی آشیانہ ہے

کیسی مسجد کہاں کا بت خانہ
ہر جگہ اس کا آستانہ ہے

عشق کی عمر کم ہی ہوتی ہے
باقی جو کچھ ہے دوستانہ ہے

انہوں نے اس غزل میں تصوف کی آمیزش سے غزل کو نیا رنگ و درجہ بخشا ہے۔
انہوں نے انسان اور زندگی کے تعلق کو ایک سفر سے تعبیر کیا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے انسان دنیا میں چند دنوں کے لئے آتا ہے اور پھر مر جاتا ہے، لیکن انہی چند دنوں میں انسان خود کو دائمی سمجھنے لگتا ہے اور اپنے لئے آرام و آسائش کی ہر ممکن شے کو حاصل کرنے میں لگ جاتا ہے یہاں تک کہ اس کی زندگی کا سفر ختم ہو جاتا ہے لیکن وہ ان تمام اشیاء یا بند وبست سے مطمئن نہیں ہوتا۔ انسان یہاں ہمیشہ رہنے کے لئے نہیں آیا بلکہ اسے تو کچھ روز کے لئے امتحان دینے کے لئے روئے زمین پر بھیجا گیا ہے۔
غزل کے تیسرے شعر میں انہوں نے پرندوں سے متعلق یہ بات واضح کی ہے پرندوں کا کوئی دیس یا پردیس نہیں ہوتا۔ وہ اُسی کو دیس بنا لیتے ہیں جہاں انہیں زندہ رہنے کے

لئے ضروری اشیاء مل جاتی ہے وہ اسی جگہ کو اپنا آشیانہ بنا لیتے ہیں جہاں زندگی گزارنے میں انہیں آسانی ہو۔

غزل کے چوتھے شعر میں وہ خدا سے متعلق یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ خدا کو کسی ایک جگہ قید کر کے مت سوچو، جس خدا کی تلاش و جستجو میں انسان اِدھر اُدھر بھٹکتا پھرتا ہے وہ خدا ہر جگہ موجود ہے، اس کا ظہور کائنات کے ہر ذرّہ میں ہے۔ وہ ہر انسان کے اندر موجود ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ خدا ہم کو نظر نہیں آتا۔ خدائے تعالیٰ کو دیکھنے کے لئے (محسوس کرنے کے لئے) انسان کو اپنی آنکھوں سے پردے ہٹانے ہونگے۔ ان پردوں کے ہٹ جانے سے ہی خدا تعالیٰ کا دیدار ہو سکتا ہے اور تب خدا کا جلوہ اسے ہر شے میں نظر آنے لگے گا۔ اصل میں عبد جب اپنے معبود کو پالیتا ہے تو اس کی تمام خواہشات معبود کی رضا میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور وہ معبود کی رضا میں خوش رہنے لگتا ہے۔ اس کی روح اپنے معبود کی عبادت میں تپ جاتی ہے اور خالص ہو کر معبود کی پہچان کر لیتی ہے تب عبد کو یہ عرفان ہو جاتا ہے کہ جس خدا کو وہ باہر اِدھر اُدھر تلاش کر رہا تھا وہ کہیں اور نہ ہو کر وہیں اس کے اندر ہی موجود ہے ۔اس کیفیت کے بعد عبد باہری دکھاوا یا بے معنی چیزوں سے دور بھاگنے لگتا ہے اور یہ کسی جبر کے نتیجے میں نہیں ہوتا بلکہ اس کی خواہشات خود بخود خاموش ہو جاتی ہیں اور اسے کائنات میں صرف خدا ہی خدا نظر آتا ہے اور وہ ''ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا'' کا مصداق بن جاتا ہے۔

''کھویا ہوا سا کچھ'' ندا فاضلی کا چوتھا شعری مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے ان کے تین شعری مجموعے ''لفظوں کا پُل''، ''مور ناچ'' اور ''آنکھ اور خواب کے درمیان'' شائع ہو چکے تھے۔ اس مجموعے میں کچھ پرانی نظمیں بھی ہیں لیکن ان میں کچھ تبدیلی کر کے پیش کیا گیا ہے۔ اس مجموعے میں انہوں نے اپنی فکری اساس کو وسعت بخشی ہے اور شاعری کے میدان میں خود کو نئے طریقے سے پیش کیا ہے۔ اس مجموعے سے غزل کے چند اشعار پیش ہیں۔

گرج برس پیاسی دھرتی پر، پھر پانی دے مولا
چڑیوں کو دانے، بچوں کو گڑ دھانی دے مولا

پھر روشن کر زہر کا پیالہ چمکا نئی صلیبیں
جھوٹوں کی دنیا میں سچ کو تابانی دے مولا

پھر مورت سے باہر آکر چاروں اور بکھر جا
پھر مندر کو کوئی میرا دیوانی دے مولا

اپنی مرضی سے کہاں اپنے سفر کے ہم ہیں
رُخ ہواؤں کا جدھر کا ہے ادھر کے ہم ہیں

دل میں نہ ہو جرأت تو محبت نہیں ملتی
خیرات میں اتنی بڑی دولت نہیں ملتی

اب کچھ اور اشعار ملاحظہ ہوں جن میں ندا فاضلی کے نئے تجربات کی عکاسی ہے۔

کبھی کبھی یوں بھی ہم نے اپنے جی کو بہلایا ہے
جن باتوں کو خود نہیں سمجھے اوروں کو سمجھایا ہے

اس بستی سے چھٹ کر یوں تو ہر چہرہ کو یاد کیا
جس سے تھوڑی سی ان بن تھی وہ اکثر یاد آیا ہے

جو دیکھتی ہیں نگاہیں وہی نہیں سب کچھ
یہ احتیاط بھی اپنے بیان میں رکھنا

یا پھر یہ اشعار دیکھئے جن میں حقیقت کو ایسے پیرائے میں پیش کیا ہے جو انوکھے پن کا حامل ہے۔

مل جل کے بیٹھنے کی روایت نہیں رہی
راوی کے پاس کوئی حکایت نہیں رہی

سب اپنی اپنی موت سے مرتے ہیں ان دنوں
اب دشتِ کربلا میں شہادت نہیں رہی

منھ کی بات سنے ہر کوئی دل کے درد کو جانے کون
آوازوں کے بازاروں میں خاموشی پہچانے کون

صرف آنکھوں سے ہی دنیا نہیں دیکھی جاتی
دل کی دھڑکن کو بھی بینائی بنا کر دیکھو

ندا فاضلی نے ان اشعار میں زندگی کے تجربات کو پیش کیا ہے یہ مختلف تجربے انہیں مختلف حادثات سے ملے یا یوں کیا جائے کہ ندا فاضلی کی زندگی ہی ایک حادثہ تھی۔ انہوں نے اپنی شاعری کا جو سفر طے کیا اسے ڈاکٹر عنوان چشتی کے اس اقتباس سے سمجھا جا سکتا ہے۔

''ندا فاضلی ایک صاحب طرز شاعر اور ادیب ہیں، شاعری میں اپنے گرد و پیش کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کو چن کر اپنی شاعری کے موضوعات کا انتخاب کیا ہے، نیز ان پر نئے انداز سے نظر ڈالی ہے اور ان کے باطن میں جھانک کر معنویت کی نئی دنیا تک رسائی کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے رسمی و روایتی شعری زبان کو خیر باد کہہ کر بول چال کی زبان اور کچھ رسیلے انداز بیان کو وسیلہ اظہار بنایا ہے، انکی شاعری میں محبت کی چمکار اپنی پوری مقصدیت اور بے باکی کے ساتھ موجود ہے۔''

ندا فاضلی کے سامنے غزل کا وہ روایتی فارم نہیں جو اب تک چلا آ رہا تھا بلکہ انہوں نے روایتی غزلیات سے ہٹ کر اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔ اس میں زندگی کی کشمکش بھی ہے آباد اور برباد

ہوتے ہوئے گھر بھی ہیں، محبوب کے ساتھ ماں، بہن، بیٹی کا عشق بھی ہے اور تہذیب کی پامالی کا ماتم بھی ہے۔ انہوں نے غزل کو ایک نیا آہنگ دیا۔ یہاں ان کی غزلوں سے کچھ اشعار پیش ہیں جو موضوع کے اعتبار سے منفرد ہیں۔

دھوپ میں نکلو، گھٹاؤں میں نہا کر دیکھو
زندگی کیا ہے کتابوں کو ہٹا کر دیکھو

ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی
جس کو بھی دیکھنا ہو کئی بار دیکھنا

ملنے جلنے والوں میں تو سب ہی اپنے جیسے ہیں
جس سے اب تک ملے نہیں وہ اکثر اچھا لگتا ہے

یہ بھی دیکھیے جن میں بات کو اچھوتے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

چاہت ہو یا پوجا سب کے اپنے اپنے سانچے ہیں
جو مورت میں ڈھل جائے وہ پیکر اچھا لگتا ہے

ہم نے سو کر دیکھا ہے نئے پرانے شہروں میں
جیسا بھی ہے، اپنے گھر کا بستر اچھا لگتا ہے

یہ کائنات کا پھیلاؤ تو بہت کم ہے
جہاں سما سکے تنہائی وہ مکان بھی دے

یوں تو سب کی ہے ہم سفر دنیا
سب کی ہوتی نہیں مگر دنیا

ان اشعار کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی شاعری کا حاوی رنگ سادگی و پرکاری کا حامل ہے۔ زبان شیریں ہے اور ایک حد تک یاس انگیزی کی جھلک بھی ہے۔ یہ اشعار روایتی موضوعات اور اسلوب کے اظہار کا احساس دلاتے ہیں جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ زبان کی سادگی و صفائی نے اس روایتی آہنگ کی آمیزش سے ایک نئی فضا تیار کی ہے۔ ان کی تخلیقی ثروت مندی کے تناظر میں اگر دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ انہیں ہندی اور انگریزی زبانوں کے علم سے بہت فائدہ ہوا ہے۔ ان کی نظمیں یا غزلیں اکثر ہندی رسائل میں بھی شائع ہوتی رہی ہیں۔ ہندی کے الفاظ کی آمیزش نے ہی انہیں ایسی انفرادیت یا جدت اور ندرت بخشی ہے۔ وہ ہندی کے مشاعروں میں بھی برابر شریک ہوتے رہے ہیں اب کچھ اس طرح کے اشعار ملاحظہ ہوں جو روایتی پیرائے میں انوکھے پن کا احساس رکھتے ہیں۔

خوفِ شکست دستِ دعا بن کے رہ گیا
کمزوریوں کا نام خدا بن کے رہ گیا

چودہ سو سال بعد بھی بیعت ہے مسئلہ
عالم تمام کرب و بلا بن کے رہ گیا

اس غزل کا مقطع دیکھئے جو اپنے آپ میں منفرد ہے۔

چاہا تو تھا ندا بھی رہے فاضلی کے ساتھ
اب کیا کہوں! میں کیسے ندا بن کے رہ گیا

مرے سفر میں نہیں قید رات اور دن کی
میں وقت کی طرح ہر وقت چلتا رہتا ہوں

خدا کی دنیا میں جینا بھی اک عبادت ہے
ہے کون اچھا برا یہ حساب رہنے دے

وہ آدمی جو خوش ہے زمانے کے واسطے
شوکیس میں سجا ہے دکھانے کے واسطے

آواز ہی سریلی ہو کافی نہیں ہے یہ
کچھ درد بھی ضروری ہے گانے کے واسطے

ان اشعار میں زندگی کے مسائل کا عکس نظر آرہا ہے۔ اس کا تعلق ان کی ذاتی زندگی سے بھی ہوسکتا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ ندا فاضلی اپنی زندگی میں اس طرح کے مسائل سے دوچار رہے ہیں۔

اب ایک غزل کے چند اشعار دیکھئے۔

سبھی سے دور کا یا پاس کا رشتہ نکل آیا
جسے بھی غور سے دیکھا وہی اپنا نکل آیا

میں صحرا چھوڑ کے جس پرسکوں بستی میں آیا تھا
اسی بستی سے کچھ دن بعد پھر صحرا نکل آیا

اندھیرا ہو گھنا تو کام کب آتی ہے بینائی
قدم چلتے رہے تو خود بہ خود رستہ نکل آیا

ان اشعار میں انہوں نے لفظوں کو برتنے اور نئی نئی تراکیب وضع کرنے میں بھی اپنی اختراعی صلاحیت سے کام لیا ہے جس سے ان کے شاعرانہ اظہار کا پتہ چلتا ہے، ان کے اشعار میں اجمال اور خوش ترکیبی کا امتزاج ہے۔

ندا فاضلی کے کچھ اشعار ایسے بھی ہیں جو قاری کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں لیکن اسی حیرت سے قاری کے ذہن میں ایک طرح کی جستجو پیدا ہو جاتی ہے۔ اشعار پیش ہیں۔

اپنے اپنے باپ سے اس کو کاٹو چھانٹوں پھر پہنو
ایک ہی جیسی سب کے لیے ہوا ایسی بنی نہیں ہے دنیا

سورج کو چونچ میں لئے مرغا کھڑا رہا
کھڑکی کے پردے کھینچ دیے رات ہوگئی

دوسرے شعر میں پیچیدہ خیال ہے ہوسکتا ہے ندا کے ذہن میں اس خیال کی دھندلی دھندلی تصویر ہو جسے واضح نہ کر سکے ہوں۔ اس شعر میں بہت پیچیدگی ہے اور یہ مضمون آفرینی، نازک خیالی اور خیال بندی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اسی وجہ سے اس شعر میں تعقید معنوی در آئی ہے۔

یادوں سے ندا فاضلی کا تعلق گہرا رہا ہے۔ انہوں نے اپنی غزلوں اور نظموں میں یادوں کو دلچسپ انداز سے پیش کیا ہے۔ یہی یادیں انھیں غم میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ اگر زندگی ہے تو غم بھی ہوگا۔

یہ تو تھی ندا فاضلی کی غزل گوئی سے متعلق گفتگو جس میں ہم نے دیکھا کہ انھوں نے اپنی غزلوں میں بھی انھیں موضوعات کو برتا ہے جنھیں نظموں میں برتا ہے۔ اسلوب بھی وہی ہے۔ الفاظ کا انتخاب بھی انھوں نے نظموں کی ہی طرح کیا ہے۔ ان کی بہت سی غزلوں پر نظم کا سا گماں ہوتا ہے یا پھر وہ غزل مسلسل کی ہیئت میں لکھی گئی ہیں۔

ان کی غزلیں پنکج ادھاس، جگجیت سنگھ، چندن داس، دیپک ہلدر، بھوپندر سنگھ، بینا زمسانی، چیترا سنگھ، ایرک ڈیوڈ، گھنشیام، غلام علی، بھارتی وشوناتھن کے علاوہ طلعت عزیز اور لتا منگیشکر کی آواز میں بھی ریکارڈ کی گئیں۔

ندا فاضلی کی ایک مشہور غزل کا مطلع ہے:

ہوش والوں کو خبر کیا بے خودی کیا چیز ہے
عشق کیجئے پھر سمجھئے زندگی کیا چیز ہے

یہ مطلع ایک فلم میں گانے کے مکھڑے کے طور پر بھی شامل ہوا ہے، اس خیال کو انھوں نے کبیر داس سے لیا ہے۔ کبیر کہتے ہیں:

ہمن ہے عشق مستانہ ہمن کو ہوشیاری کیا

زندگی کا یہ کھیل اعتماد کا کھیل ہے اگر خود میں اعتماد کی کمی ہو تو زندگی بے معنی ہو جاتی ہے۔ اسی خیال کو انھوں نے غزل کے ایک شعر میں پیش کیا ہے:

دل میں نہ ہو جرأت تو محبت نہیں ملتی
خیرات میں اتنی بڑی دولت نہیں ملتی

انسانیت کا جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے ان کی نظموں، دوہوں، گیتوں اور غزلوں میں جگہ جگہ ذکر ہے۔ ندا فاضلی کے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا عقیدہ کسی کے دکھ درد میں شریک ہونا ہے۔ اسی عقیدے سے متعلق ان کی غزل کا ایک شعر پیش ہے:

کسی گھر کے کسی بجھتے ہوئے چولہے میں ڈھونڈ اس کو
جو چوٹی اور داڑھی میں رہے وہ دین داری کیا

ماں سے عشق کی حد کو جاننے کے لیے ان کی غزل کا یہ شعر دیکھئے:

اللہ عرب میں فارسی والوں میں وہ خدا
میں نے جو ماں کا نام لیا پھر کسی کو کیا

اس طرح کے تصورات کسی اور شاعر کے یہاں ملنا ناممکن تو نہیں لیکن مشکل ضرور ہیں۔

☆☆☆

سب کی پوجا ایک سی، الگ الگ ہر ریت
مسجد جائے مولوی، کوئل گائے گیت

دوہے

ندا فاضلی نے نظم اور غزل کے علاوہ دوہے بھی لکھے ہیں۔ اردو میں دوہے کی روایت بہت پرانی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ دوہا اردو ادب میں ہندی کے زیر اثر آیا، اردو دوہے کی تاریخ سے متعلق ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی اپنی کتاب ''اردو شاعری میں دوہے کی روایت'' میں رقمطراز ہیں:

> ''اردو شاعری کے آغاز وارتقاء کے ساتھ ہی اردو دوہے کی صنف وجود میں آکر اپنی ارتقائی منزل طے کرنے لگی اور دوہوں کی ہیئت تو پراکرت اور اپبھرنش کے اڑتالیس حرفی قدیم دوہوں کی ہیئت پر مبنی ہے۔ جو دو دو سطروں میں لکھا جاتا ہے اور دونوں سطریں ہم قافیہ ہوتی ہیں۔ ہر سطر میں چوبیس ماترائیں ہوتی ہیں اور اس کی ایک مخصوص چال ہوتی ہے۔ اردو شعراء نے جدت طرازی سے کام لے کر دوہے کی ہیئت کو برقرار رکھتے ہوئے اردو دوہوں میں مختلف اوزان کو انکے مخصوص آہنگ کے ساتھ بھی استعمال کیا۔ مگر اردو یا ہندی کے ماہرین عروض نے

ابھی تک ان کی طرف خاص توجہ نہیں دی ہے‘‘ ۔[۲]

سب سے پہلے امیر خسرو نے دوہے لکھے۔ جدید شعراء میں سب سے پہلے سرشار نے دوہے لکھے (ڈاکٹر شاہد میر)۔ اس کے بعد بہت سے شعراء نے دوہے لکھے۔ لیکن اردو دوہے کے حوالے سے جن کا نام معتبر ہے وہ جمیل الدین عالی ہیں۔ انھوں نے اردو میں دوہوں کو استحکام بخشا اور بہت سے دوہے لکھ کر اس فن کو آگے بڑھایا۔ جمیل الدین عالی کے بعد بیکل اتساہی، کرشن موہن، ش۔ک۔ نظام۔ ابراہیم اشک، ندا فاضلی، اور دوسرے شعراء نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔

ندا فاضلی نے نظموں اور غزلوں کی طرح دوہوں میں بھی اپنے منفرد اسلوب نگارش سے ایک نئی راہ تلاش کی۔ انھوں نے اپنے دوہوں میں اس کے فن کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ دوہوں میں بھی انھوں نے آسان اور سادہ الفاظ کا انتخاب کیا ہے جس سے ان کے دوہے بوجھل محسوس نہیں ہوتے۔ ان دوہوں میں انہوں نے اپنے مزاج کے اعتبار سے رنگ آمیزی کی ہے۔ یہ رنگ آمیزی ہمیں کبیر اور سورداس کے یہاں نظر آتی ہے۔ اس رنگ آمیزی میں انہوں نے اپنی زبان اور لہجے کا خاص خیال رکھا ہے۔

عام زندگی میں پیش آنے والے واقعات کو دوہوں میں پیش کر کے انھوں نے اس فن کو جلا بخشی۔ ان کے دوہوں میں جدت بھی ہے، وسعت بھی ہے۔ انھوں نے ہندوستانی تہذیب کو بھی دوہوں میں پیش کر کے اپنے فن کو پختگی بخشی ہے۔ گاؤں، شہر، کھیت، درخت، پرندے، ماں، بھائی بہن کے رشتے، یہ سبھی ان کے دوہوں میں بڑے سلیقے سے پیش ہوئے ہیں۔ ان کے چند دوہے یہاں مثال کے لیے پیش ہیں:

چھوٹی کرن اذان کی، جاگے پنچھی ڈھور
چڑیوں کی چہکار میں، کرے تلاوت بھور

عیسیٰ اللہ ایشور، سارے منتر سیکھ
جانے کب کس نام سے، ملے زیادہ بھیک

پہلے دوہے میں ندافاضلی نے گاؤں کا نقشہ پیش کیا ہے صبح کو جب اذان ہوتی ہے تو گاؤں میں جو بھی جانور ہوتے ہیں، بھینس، بکریاں، گائے، بیل سبھی جاگ جاتے ہیں اوران کے بولنے کی آوازیں بھی آنے لگتی ہیں۔ چاروں طرف سے چڑیوں، پرندوں کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ چڑیوں کی چہکار میں ندافاضلی کو عبادت کا عکس نظر آتا ہے۔ کیونکہ ہر چیز اپنے اپنے طریقے اوراپنی اپنی زبان میں خدائے برحق کی عبادت کرتی ہے۔

دوسرے دوہے میں انھوں نے آج کے انسان کے ڈھونگی پن کا ذکر کیا ہے۔ جن لوگو ں نے خدا کو خانوں میں بانٹ رکھا ہے یا جو موقع پاتے ہی اللہ اور ایشور کے نام پر اپنا پیٹ بھرتے ہیں:

نرمل نشچل پریم تھا، یا ہاتھوں میں سواد
ہر بھاجی ہر دال میں، ماں آتی ہے یاد

گرجا میں عیسیٰ بسیں، مسجد میں رحمان
ماں کے پیروں سے چلے، ہر آنگن بھگوان

ان دوہوں میں ندا فاضلی نے ماں کی عظمت کا بیان کیا ہے۔ جیسا کہ ہم کو معلوم ہے کہ انھوں نے ماں کے پیار اور بچوں کے پیار کو اپنی شاعری میں خاص طور پر بیان کیا ہے۔ دوہوں میں بھی انھوں نے ماں کے پیار کا ذکر کیا ہے۔ پہلے دوہے میں انھوں نے وہی تصور پیش کیا ہے جو انھوں نے اپنی ایک نظم جس کا مصرعہ ''بیسن کی سوندھی روٹی پہ کھٹی چٹنی جیسی ماں'' ہے میں پیش کیا ہے۔ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ انھوں نے نظموں، غزلوں، گیتوں اور دوہوں میں اچھی شاعری کے نمونے پیش کر کے اپنا مقام بلند کیا ہے۔ اسی طرح کے خیال کو سمیٹے ہوئے ایک دوہا پیش ہے:

ساتوں دن بھگوان کے، کیا منگل کیا پیر
جس دن سوئے دیر تک، بھوکا رہے فقیر

اس دوہے میں انہوں نے اس تصور پر طنز کیا ہے۔جس میں لوگ یہ سوچتے ہیں کسی خاص دن میں خیرات کرنے پر ہی ثواب ملتا ہے،اصل تو یہ ہے کہ کسی بھی دن یہ ثواب حاصل کیا جاسکتا ہے۔کسی شخص کو اتوار کے دن بھوک لگی ہے لیکن اس کے پاس کھانے کا کوئی بندوبست نہیں ہے تو وہ آپ کے در پر سوالی بن کر آتا ہے اور آپ اس سے کہتے ہیں کہ میں تو صرف پیر کے روز ہی خیرات کرتا ہوں ،اسی دن ثواب زیادہ ملتا ہے تو سچ بتایئے کہ آپ کا خدا آپ سے خوش ہوسکتا ہے،چاہے آپ پیر کے روز کتنی بھی خیرات کردیں۔

اسی طرح کا ایک اور دوہا ہے:

وہ صوفی کا قول ہو ،یا پنڈت کا گیان
جتنی بیتے آپ پر ،اتنا ہی سچ مان

ایک منفرد خیال لئے یہ دوہا ملاحظہ کیجئے:

منشی دھنپت رائے تو، ٹنگے ہیں بن کے یاد
سننے والا کون ہے ،ہوری کی فریاد

اس دوہے سے وہی شخص لطف اندوز ہوسکتا ہے جس نے منشی پریم چند کے ''گئودان'' کا مطالعہ کیا ہو۔ندا فاضلی اس دوہے میں کہ رہے ہیں کہ جو مسئلہ اس وقت تھا جب پریم چند نے ''گئودان'' کی تخلیق کی تھی ،وہی مسئلہ آج بھی بنا ہوا ہے لیکن لمحۂ فکر یہ ہے کہ آج کے دور کا مسئلہ اس دور کے مسئلے سے کہیں زیادہ خطرناک ہے اور اس کی فریاد سننے والا آج کوئی نہیں ہے۔مندرجہ ذیل دوہے میں فرقہ واریت پر کس طرح چوٹ کی گئی ہے ملاحظہ کیجئے:

گھر والے گھر پہ لکھیں ،ولیم ارجن خان
مٹی سے مٹی کہے،سارے ایک سمان

آدمی کی ناپائیداری کو ندا فاضلی نے اپنے دوہے میں اس طرح پیش کیا ہے کہ ہر انسان دنیا میں جانے کے لئے آیا ہے لیکن وہ دنیا کے لئے اتنے اہتمام کرتا ہے کہ جیسے اسے

ہمیشہ ہی اس دنیا میں رہنا ہے۔آدمی اپنی آرائش وآسائش کے لئے کتنا بھی اور کچھ بھی کرلے لیکن مرنے کے بعد وہ تمام چیزیں ختم ہوجاتی ہیں اگر کچھ باقی رہتا ہے تو وہ اس کی یاد ہے۔اب یہ یاد اس کے اعمال پر منحصر ہے کہ اس کو کس طرح یاد کیا جائے۔اگر اس نے اچھے کارنامے انجام دئے ہیں تو لوگ اسے خیر سے یاد کرینگے اور لوگوں کا نظریہ اس کے لئے مثبت ہوگا اور اگر اس کے اعمال غلط ہیں تو اسے منفی نظریے سے ہی دیکھا جائیگا۔دوہا ملاحظہ کیجئے:

کوئی تیرے سامنے،کوئی تیرے بعد
کھوجاتا ہے آدمی،رہ جاتی ہے یاد

کہا گیا ہے کہ دنیا کی ہر شے اپنے طور طریقے سے حمد الہٰی کرتی ہے ندا فاضلی نے اسی تصور کو ذیل کے دوہے میں کس خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔

سب کی پوجا ایک سی،الگ الگ ہر ریت
مسجد جائے مولوی،کوئل گائے گیت

اس دوہے میں طنز کی نشتریت بھی در آئی ہے کہ مذہب کے ٹھیکیدار جب تبھی سے اپنے دستور کے مطابق عبادت کرنے پر زور دیتے ہیں اور اس زور میں تشدد بھی شامل ہوجاتا ہے۔میرے خیال میں یہ دوہا ان لوگوں کے لئے ایک سبق ہے۔اسی طرح کا ایک اور دوہا ملاحظہ کیجئے:

بچہ بولا دیکھ کر ،مسجد عالی شان
اللہ تیرے ایک کو ،اتنا بڑا مکان

اس دوہے میں پیش کئے گئے درد کو اس بچے سے پوچھئے جس کا کوئی گھر نہیں ہے اور وہ چلچلاتی دھوپ اور خون منجمد کردینے والی سردی میں کبھی کسی سڑک کے کنارے اور کبھی کسی پارک میں رہنے پر مجبور ہے۔وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ ایک چھت کے نیچے کی گرماہٹ کیا ہوتی ہے۔گرمی کے دنوں میں چھت کے نیچے ایئر کنڈیشنر کا سکون کیا ہوتا ہے۔مسجد،مندر میں کوئی انسان تو نہیں رہتا وہاں تو صرف اللہ اور ایشور ہی رہتا ہے۔اس کے لئے تو تھوڑی سی جگہ کافی ہے،تو پھر یہ اتنی

بڑی مسجد کیوں ہے؟اور وہاں گرمی اور سردی سے بچنے کا بھی بندوبست ہے۔اصل تو یہ ہے کہ انسان کے درد کو جاننا اور اس کا مداوا کرنا ہی خدا اور ایشور کے نزدیک سب سے بڑی عبادت ہے۔اسی خیال کو ان دوہوں میں ملاحظہ کیجئے:

چاہے گیتا باچیئے، یا پڑھیئے قرآن
میرا تیرا پیار ہی، ہر پستک کا گیان

اندر مورت پر چڑھے، گھی پوری لوبان
مندر کے باہر کھڑا، ایشور مانگے دان

ندا فاضلی کے یہ دوہے حیات انسانی پر مبنی حقیقت ہیں جن میں کبیرداس کا عکس دیکھا جاسکتا ہے۔کچھ دوہے اپنے اندر اتنی وسعت لئے ہوئے ہیں کہ ان دوہوں کے خیال پر ایک طویل نظم بھی لکھی جاسکتی ہے۔تصوف سے متعلق ندا فاضلی کے یہ دوہے ملاحظہ کیجئے:

سپنا جھرنا نیند کا ،جاگی آنکھیں پیاس
پانا کھونا کھوجنا ،سانسوں کا اتہاس

میں رویا پردیس میں، بھیگا ماں کا پیار
دکھ نے دکھ سے بات کی، بن چٹھی بن تار

جیون کے دن رین کا، کیسے لگے حساب
دیمک کے گھر بیٹھ کر، لیکھک لکھے کتاب

یا پھر ان دوہوں کا خیال ملاحظہ کیجئے:

اوپر سے گڑیا ہنسے، اندر پولم پول
گڑیا سے ہے پیار تو، ٹانکوں کو مت کھول

سورج سے دھرتی تپے، چھایا ڈھونڈے کاگ
تن کے اندر من جلے، دھواں دکھے نہ آگ

ان دوہوں میں سماجی حالات پر تبصرے کے ساتھ ساتھ باہری دکھاوے پر دھیمی لیکن پراثر چوٹ کی گئی ہے جو ہر انسانی ذہن کو متاثر کرتی ہے۔ آخر میں انکے چند دوہے پیش ہیں:

چڑیا نے اُڑ کر کہا، میرا ہے آکاش
بولا شکرا ڈال سے، یوں ہی ہوتا کاش

☆☆

لے کے تن کے ناپ کو، گھومے بستی گاؤں
ہر چادر کے گھیر سے، باہر نکلے پاؤں

☆☆

دکھ کی نگری کون سی، آنسو کی کیا ذات
سارے تارے دور کے، سب کے چھوٹے ہات

☆☆

چاقو کاٹے بانس کو، بنسی کھولے بھید
اتنے ہی سُر جانئے، جتنے اس میں چھید

☆☆

کس سے پوچھے راستہ، گلّہ بچھڑی بھیڑ
اپنی چھایا اوڑھ کے، سوگئے سارے پیڑ

☆☆

سودا لینے ہاٹ میں، کیسے جائے نار
چاقو لے کے ہاتھ میں، بیٹھا ہے بازار

☆☆

سا سے سا تک سات سر، سات سروں میں راگ
اتنا ہی سنگیت ہے، جتنی تجھ میں آگ

☆☆

اچھی سنگت بیٹھ کر، سنگی بدلے روپ
جیسے مل کر آم سے، میٹھی ہوگئی دھوپ

☆☆
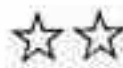
سیدھا سادھا ڈاکیہ، جادو کرے مہان
ایک ہی تھیلے میں بھرے، آنسو اور مسکان

☆☆

سنا ہے اپنے گاؤں میں، رہا نہ اب وہ نیم
جس کے مانند تھے، سارے وید حکیم

☆☆

دکھ تو مجھ کو بھی ہوا، ملا نہ تیرا سات
شاید تجھ میں بھی نہ ہو، تیرے جیسی بات

☆☆
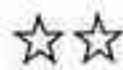
چیخے گھر کے دوار کی، لکڑی ہر برسات
کٹ کر بھی مرتے نہیں، پیڑوں میں دن رات

☆☆

برکھا سب کو دان دے، جس کی جتنی پیاس
موتی سی یہ سیپ میں، مٹی میں یہ گھاس

☆☆

میں کیا جانوں تو بتا، تو میرا کون
میرے من کی بات کو، بولے تیرا مون

☆☆

سیتا راون رام کا، کریں وبھاجن لوگ
ایک ہی تن میں دیکھیے، تینوں کا سنجوگ

☆☆

جادو ٹونا روز کا، بچوں کا بیوہار
چھوٹی سی ایک گیند میں، بھر دیں سب سنسار

☆☆

پنچھی بالک پھول جل، الگ الگ آکار
ماٹی کا گھر ایک ہی، سارے رشتہ دار

☆☆

گھر کو کھوجے رات دن، گھر سے نکلے پاؤں
وہ رستہ ہی کھو گیا، جس رستہ تھا گاؤں

☆☆

آنگن آنگن بیٹیاں، چھانٹی بانٹی جائیں
جیسے بالیں گیہوں کی، پکے تو کاٹی جائیں

☆☆

اس جیسا تو دوسرا، ملنا تھا دشوار
لیکن اس کی کھوج میں، پھیل گیا سنسار

☆☆

ندیا سے بادل بنے، بادل سے برسات
تو چاہے جو روپ لے، میں ہوں تیرے ساتھ

☆☆
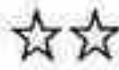
آج کئی دن بعد وہ، ملا تو یوں کی بات
ہونٹوں کے الفاظ کو، بول رہے تھے ہات

☆☆

یگ یگ سے ہر باغ کا، یہ ہی ایک اُصول
جس کو ہنسنا آگیا، وہ مٹی پھول

☆☆

میں بھی تو بھی یاتری، چلتی رکتی ریل
اپنے اپنے گاؤں تک، سب کا سب سے میل

☆☆

پوجا گھر میں مورتی، میرؔا کے سنگ شیام
جتنی جس کی چاکری، اتنے اس کے دام

☆☆

میں کاغذ تو کلپنا، تجھ میں میں ساکار
اپنی ہی تصویر کو، پوجے رچنا کار

☆☆

درپن میں آنکھیں بنیں، دیواروں میں کان
نینوں سے ہنسنے لگی، ادھروں کی مسکان

☆☆

بگیا مہکے رات دن، آئیں جائیں پھول
پرسوں نرسوں آج کل، بھولے من کی بھول

☆☆

چھوٹا کرکے دیکھیے، جیون کا وستار
آنکھوں بھر آکاش ہے، بانہوں بھر سنسار

☆☆

اوپر سے گڑیا ہنسے اندر کاٹ کباڑ
گڑیا سے ہے پیار تو، کیلیں نہیں اُکھاڑ

☆☆
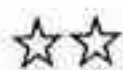
بہنیں چڑیاں دھوپ کی، دور گگن سے آئیں
ہر آنگن مہمان سی، پکڑوں تو اُڑ جائیں

☆☆

جیون کے سر تال کا، کیسے لگے حساب
دیمک کے گھر بیٹھ کر، لیکھک لکھے کتاب

☆☆

بوڑھا پیپل گھاٹ کا، بتیائے دن رات
جو بھی گزرے پاس سے، سر پر رکھ دے ہات

☆☆

نقشہ لے کر ہاتھ میں، بچہ ہے حیران
کیسے دیمک کھا گئی، اس کا ہندوستان

☆☆

کوئی تیرے سامنے، کوئی میرے بعد
کھو جاتا ہے آدمی، رہ جاتی ہے یاد

☆☆

یہ ہے کیسا معجزہ، کفن دفن کے بعد
چلتا پھرتا ہر جگہ، ملتا ہے بغداد

☆☆

آنکھوں سے آنکھوں تلک، رستہ ہے ہموار
دل سے دل کا فاصلہ، لیکن ہے دشوار

☆☆

نرمل نشچل پریم تھا، یا ہاتھوں میں سواد
ہر بھاجی ہر دال میں ماں آتی ہے یاد

☆☆

ساتوں دن بھگوان کے، کیا منگل کیا پیر
جس دن سوئے دیر تک، بھوکا رہے فقیر

☆☆

وہ صوفی کا قول ہو، یا پنڈت کا گیان
جتنی بیتے آپ پر، اتنا ہی سچ مان

☆☆

بچہ بولا دیکھ کر، مسجد عالی شان
اللہ تیرے ایک کو، اتنا بڑا مکان

☆☆
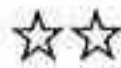
سورج سے دھرتی تپے، چھایا ڈھونڈے کاگ
تن کے اندر من جلے، دھواں دکھے نہ آگ

☆☆

مجھ جیسا ایک آدمی، میرا ہی ہم نام
اُلٹا سیدھا وہ چلے، مجھے کرے بدنام

☆☆

چڑیوں کو چہکار دے، گیتوں کو دے بول
سورج بن آکاش ہے، گوری گھونگٹ کھول

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کہیں زمیں تو کہیں آسماں نہیں ملتا

(ندا فاضلی)

نغمہ نگاری

فلمی گیتوں کو ادب کے دائرے میں نہیں رکھا جاتا لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں ہے کہ گیتوں کا کوئی مقام نہیں ہے۔ مجروح سلطانپوری، ساحر لدھیانوی، شکیل بدایونی، جاں نثار اختر جیسے شعراء نے فلمی گیت لکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ اگر فلمی گیت ادب میں شامل نہیں ہیں تو ادب سے باہر بھی نہیں ہیں۔ بار بار یہ سوال اٹھتا ہے کہ گیت کا تعین کس طرح کیا جائے۔ یہ بات بالکل بے مطلب ہے کہ گیت کا تعین کس معیار پر کیا جائے۔ کیونکہ گیت فلم کی Situation کے حساب سے لکھے جاتے ہیں اور اس میں شاعر یا نغمہ نگار اپنی مرضی سے اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر سکتا بلکہ کئی مرتبہ اسے فلم ڈائریکٹر یا دوسرے لوگوں کی ضرورت کا لحاظ کرنا پڑتا ہے اور ایسے میں وہ کھل کر شاعری نہیں کر پاتا۔ ادب میں وہی تخلیق شامل ہوتی ہے جو بالکل آزادانہ طور پر لکھی گئی ہو، اور اس میں کسی دوسرے کا دخل نہ ہو۔ لیکن مذکورہ بالا شعراء نے کچھ اس طرح کے نغمے لکھ کر ان میں ادبیت کی جھلک پیدا کی۔ ندا فاضلی نے بھی نغمہ نگاری میں خوب نام کمایا۔ انھوں نے نہ صرف اچھے اور کامیاب نغمے لکھے بلکہ اچھی شاعری کی مثال بھی پیش کی۔ انھوں

نے بہت سی فلموں میں نغمے لکھے اور یہاں بھی اپنی انفرادیت کو باقی رکھا۔ نغموں میں عام، سادہ الفاظ کا استعمال کر کے اپنی نغمہ نگاری کو خاص مرتبہ عطا کیا۔

فلموں میں آنے سے متعلق ندا فاضلی نے کہا ہے کہ وہ راجندر سنگھ بیدی کے توسط سے فلمی دنیا میں آئے۔ انھوں نے نغموں کے علاوہ فلموں میں مکالمے بھی لکھے۔ یہاں ان کی ان فلموں کے نام پیش کیے جا رہے ہیں جن میں انھوں نے نغمے لکھے۔

رضیہ سلطانہ، آپ تو ایسے نہ تھے، آہستہ آہستہ، ناخدا، بلو بادشاہ، لوہا، ملک، کنواری بہو، جائیداد، وجے، ایک نیا رشتہ۔

ان فلموں کے علاوہ بھی انھوں نے بہت سی فلموں میں نغمہ نگاری کی ہے۔ وہ نظموں، غزلوں اور دوہوں کی طرح ایک کامیاب نغمہ نگار رہے۔ انھوں نے نغمہ نگاری کو صرف روزی روٹی کے لیے ہی اپنایا۔ لیکن اس میں بھی انھوں نے اچھی شاعری پیش کر کے ایک کامیاب اور اچھے شاعر کی شناخت قائم رکھی اور نغموں میں بھی شاعری کے معیار کو باقی رکھا۔ اور زندگی کے مسائل، گاؤں، شہر، درخت کا ذکر کیا ہے۔ یہ وہی رنگ ہے جو ان کی ہر شعری صنف میں ملتا ہے۔ گیتوں میں بھی انھوں نے آسان اور سادہ الفاظ کا استعمال کیا ہے لیکن بہت سے گیتوں میں استعاراتی اسلوب بھی ملتا ہے۔ ان میں ایک طرح کی روشنی نظر آتی ہے۔ انہوں نے گیتوں میں نئے آہنگ اور نئی معنویت سے ایسی فضا کی تشکیل کی ہے جو انسانی ذہن کو معطر کر دے۔

پریمی رومانی ندا فاضلی کے گیتوں سے متعلق لکھتے ہیں:

> ''ندا فاضلی کے گیت سریلے صاف اور خوشنما ہیں۔ ان کے گیتوں میں افسردگی، تحیر، گھٹن، آرزومندی، ترنم اور غنائیت یہ سب کچھ ملتا ہے۔ مختصر یہ کہ ندا فاضلی نے گیت کو فروغ دینے میں جو تراکیب نئے تجربے اور اخلاقی اسلوب اپنایا ہے۔ وہ ان ہی کا کام ہے۔ ان کی غزلوں میں بھی گیت کی ہی کیفیت

پائی جاتی ہے، محبت سے گہری عقیدت اور بے یقینی کا عالم احتیاط کا دم اور غم کی تلخی ندا فاضلی کی شاعری کے خاص موضوعات ہیں"۔ ۳۲

ندا فاضلی کی نغمہ نگاری کے کچھ نمونے ملاحظہ ہوں:

کئی دنوں سے چاند اگا

نہ سورج نکلا ہے

جب سے تم پردیس گئے ہو

بہت اندھیرا ہے

رات رات بھر پانی برسے

دھول اڑے دن دن بھر

لوہارن لوہے کو پیٹے

لگے ہتھوڑا من پر

بڑھئی بچارا لکڑی چیرے

میں دیکھوں اٹھ اٹھ کر

نئی صراحی میں بھی پانی

ندیا جیسا ہے

جب سے تم——

یہ ان کا بہت مشہور گیت ہے۔ بالکل واضح الفاظ و انداز میں انھوں نے ہجر میں تڑپتی ہوئی ایک ناری کے درد کو اس گیت میں پیش کیا ہے وہی گاؤں کا سارا منظر، لوہارن، لوہے کو پیٹے، بڑھئی، صراحی یہ سب گاؤں دیہات کا منظر پیش کر رہے ہیں جو کہ ہندوستانی تہذیب کی عکاسی ہے۔

ایک اور گیت جس میں عشق رومان اور ہندوستانی تہذیب کی آمیزش نے ایک دلکش فضا تیار کر دی ہے:

کھنکتا ہے، رو پہلا دن تو سارا
کہیں سے رات کھوٹی ہوگئی ہے

....

اس سے آگے اس گیت کا آخری حصہ ملاحظہ ہو:

صراحی اب بھی گر جاتی ہے اس سے
وہ اب بھی کچے ٹانکے ٹانکتی ہے
گلی سے کوئی بھی آواز آئے
وہ گھر میں سب سے پہلے جھانکتی ہے
مصالحہ اب بھی موٹا پیستی ہے
مگر کچھ گول روٹی ہوگئی ہے
کھنکتا ہے روپہلا دن تو سارا
کہیں سے رات کھوٹی ہوگئی ہے

اس گیت میں انھوں نے ایک معصوم اور کم عمر لڑکی کا ذکر کیا ہے۔ وہ ان الفاظ کے ذریعے اس لڑکی کا خاکہ کھینچتے ہیں۔ لڑکی کا ذرا بڑا ہونا لیکن اس کے ساتھ اس کی عادات واطوار کا نہ بدلنا، یعنی مصالحہ موٹا پیسنا، کچے ٹانکے، جن کو بعد میں ضرورت کے اعتبار سے اس لڑکی کی ماں پکا کر دیتی ہے۔ ہاں اتنا ضرور سدھار ہوا ہے کہ اس نے روٹی ضرور گول بنانا سیکھ لی ہے۔ چند گیت اور دیکھیے:

چاندا گا کے دیکھ اور مانجھی
رات جگا کے دیکھ
سرگم سرگم گیت چھپے ہیں
ساز اٹھا کے دیکھ
اتر، دکھن، پورب، پچھم
الگ الگ ہر دھارا

جگہ جگہ بٹوارا

دکھ کا چہرہ ایک ہی چہرہ

دکھ کے بھیس ہزاروں

میری کٹیا، تیرا آنگن

بنگلہ دیش ہزاروں

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ندا فاضلی کے موضوعات وہی ہیں جن کو انھوں نے نظموں، غزلوں یا دوہوں میں پیش کیا ہے اسلوب بھی انھوں نے وہی رکھا ہے، آسان، سادہ الفاظ کے ذریعے اپنی بات کو کہنا۔ ان کے گیت بھی ہندوستانی تہذیب میں رنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ کامیاب نغمہ نگار کے ساتھ ساتھ کامیاب شاعر بھی ہیں اور یہی انھیں اپنے ہمعصروں میں منفرد بناتا ہے۔ ان کے گیتوں میں یہ بات تلاش کرنا ذرا مشکل ہے کہ انھوں نے اردو کو کہاں سے شروع کیا ہے اور کہاں ختم کیا یا ہندی کب شروع کردی ہے، وہ اپنی گفتگو کو اس انداز سے شروع کرتے ہیں ایسا لگتا ہے جیسے کوئی آپس میں بلا تکلف بات چیت کر رہا ہو۔ ان کے ذہن میں جو بھی تصور آتا ہے وہ اسے بغیر کسی تصنع کے اپنی شاعری میں پیش کر دیتے ہیں۔ ندا فاضلی کی شاعری میں محبت عبادت کا درجہ رکھتی ہے انسان دوستی ان کی شاعری کا خاصہ ہے وہ معنوی اور اصطلاحی دونوں معنوں میں وضع دار نظر آتے ہیں۔

ندا فاضلی کا یہ گیت ملاحظہ کیجئے جو انھوں نے مدر ٹیریسا کے نام کیا ہے:

ہر دھوپ میں چھاؤں سی

ہر سر پہ دعاؤں سی

روتی ہوئی آنکھوں کی

تحریر جو پڑھتی تھی

انسان کی خاطر جو

بھگوان سے لڑتی تھی

وہ پیاسی زمینوں پر
اتری تھی گھٹاؤں سی

بیماروں کے بستر پر
سوتا تھا خدا اس کا
لاچاروں کے چہروں سے
روتا تھا خدا اس کا
روشن تھی اندھیروں میں
وہ ماں کی دعاؤں سی
وہ پیاس کے مندر میں
برسات کی مورت تھی
وہ بھوک کی مسجد میں
روٹی کی عبادت تھی
وہ درد کے گرجا میں
انسان کی خدمت تھی
نفرت کے اندھیروں میں
رحمت کی ضیاؤں سی

ہر سر پہ........

ایک دلچسپ واقعہ یہاں پیش کرنا چاہوں گا وہ یہ ہے کہ جب فلم رضیہ سلطان کی شوٹنگ چل رہی تھی تو اسی دوران نغمہ نگار جاں نثار اختر کا انتقال ہوگیا وہی اس فلم کے لیے نغمے لکھ رہے تھے۔صرف دو نغمے باقی رہ گئے تھے۔کمال امروہوی نے ندا فاضلی سے ملاقات کی اور کہا مجھے ایک مکمل شاعر کی تلاش تھی جو مل گیا۔میں باقی دو نغمے اسی یعنی (ندا فاضلی) سے لکھوانا چاہتا ہوں۔ندا فاضلی نے وہ دو نغمے لکھے۔جس نے یہ نغمے گائے تھے وہ مرزا قبن تھے۔

مرزا کبن کوئی پیشہ ور سنگر نہیں تھے بلکہ وہ جب سوز خواں تھے۔ کمال امروہوی محرم کے دنوں میں کسی مجلس میں شامل تھے تو اسی مجلس میں مرزا قبن سوز خوانی کررہے تھے۔ کمال امروہوی کو مرزا کبن کی آواز بہت پسند آئی اور انھوں نے یہ دو نغمے مرزا کبن کی آواز میں ہی ریکارڈ کرائے۔

☆☆☆

دشمنی لاکھ سہی ختم نہ کیجیے رشتہ
دل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملاتے رہیے

(ندؔا فاضلی)

ماہیے

ماہیہ تین مصرعوں کی کوتاہ مصری غنائی نظم ہے۔ یہ اردو میں پنجابی سے آئی اور اردو عروض کے مطابق ماہیہ کے دو وزن بیان کئے گئے ہیں۔

۱۔ مفعول مفاعیلن
مفعول مفاعیلن
مفعول مفاعیلن

۲۔ مفعول مفاعیلن
فعل مفاعیلن
مفعول مفاعیلن

اردو شاعری میں اس کے افاعیل کی کل تعداد ۱۹ ہے جو سات، پانچ اور سات میں ترتیب دیئے گئے ہیں۔ ندا فاضلی نے دونوں وزن میں ماہیے کہے ہیں۔ ماہیہ میں بھی انہوں نے نظم اور غزل کی طرح مضامین برتے ہیں۔ مثال کے لئے ان کے چند ماہیے ملاحظہ کیجئے:

پاگل ہے مراقی ہے
مردہ ہے نہ زندہ
یہ بچہ عراقی ہے

بے نام سا مرقد ہے
مٹی ہوئی مٹی
اب جنگ نہ سرحد ہے

حق گوئی کا حامی ہے
نالاں ہیں سب اس سے
آئینہ حرامی ہے

کیا خوب زمانہ ہے
جتنی حقیقت ہے
اتنا ہی فسانہ ہے

تالے میں لگی چابی
بھیا کی تھالی میں
گڑ رکھنے لگی بھابھی

سر بنسی کا لہرایا
رادھا کی گاگر میں
پھر چاند اتر آیا

تندور میں روٹی ہے
بھوک ادھر می ہے
داڑھی ہے نہ چوٹی ہے

ڈالی پہ پرندہ ہے
آنکھوں میں بھر لیجے
منظر ابھی زندہ ہے

ست رنگی دوپٹہ ہے
دیکھے جو نہ مڑ کے
وہ اُلّو کا پٹھا ہے

اللہ کہاں ہے تو؟
پھر بھی جہاں ہے تو
کیا سچ ہے وہاں ہے تو؟

چھجے پر کبوتر ہے

دھوپ میں قاصد ہے

حجرے میں قلندر ہے

ہردوار پہ میلا ہے

دوار کے پیچھے تو

ہر کوئی اکیلا ہے

☆☆☆

نثر

شاعری کے ساتھ ندا فاضلی نے اردو نثر کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی۔ اپنے منفرد اسلوب سے اردو نثر میں اضافہ کیا اور اپنے اسلوب کے موجد و مؤخر ثابت ہوئے۔ ان کی سب سے پہلی نثری تصنیف ''ملاقاتیں'' ہے جس میں انٹرویو ہیں۔ نثر میں بھی انھوں نے اپنا ڈکشن خود ایجاد کیا اور اسے آخر تک نبھایا بھی۔ اس طرح کے نثری نمونے کسی اور نثر نگار کے یہاں نہیں ملتے۔ انھوں نے شاعری کی طرح نثر میں بھی لفظوں کی آرائش سے کام نہیں لیا۔ بلکہ آسان اور سادہ الفاظ کے ذریعہ اپنی بات پیش کی ہے۔ اپنا اسلوب تلاش کرنا بہت مشکل کام ہوتا ہے اور اس سے بھی مشکل کام ہوتا ہے اس اسلوب کو بنائے رکھنا، ندا فاضلی اس میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ موضوع چاہے سنجیدہ ہو یا غیر سنجیدہ انھوں نے دونوں طرح کے موضوعات کو آسان اور عام فہم الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ یہی ان کا خاصہ ہے۔ الفاظ کی بندشوں اور آرائش وزیبائش سے اس بات کی روح مجروح ہو جاتی ہے جو بات کہی جاتی ہے اور یہی زیبائش وآرائش ترسیل میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔

''ملاقاتیں'' ان کی پہلی نثری تصنیف ہے جو شروع میں منظر عام پر آئی۔ یہ خاکوں کا مجموعہ ہے۔ یہ مشاہیر ادب سے ملاقاتوں پر ایک انٹرویو نما کتاب ہے جس میں انھوں نے جاں

نثار اختر، عصمت چغتائی، کیفی اعظمی، سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، اختر الایمان جیسے اہم فنکاروں کے خاکے پیش کیے ہیں۔ اس میں انھوں نے ان کی نفسیات پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ ''ملاقاتیں'' جب شائع ہوئی تو بمبئی میں اشتہاروں کے ذریعہ اس کی تشہیر کی گئی اور ادبی حلقوں میں شور وغل ہوا۔ اس کے شائع ہونے کے بعد بھی یہ کتاب ادبی حلقوں میں کافی دنوں تک موضوع بحث بنی رہی۔ اس میں انھوں نے سفاکانہ طور پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ جو بہت سے لوگوں کو ناگوار بھی گزرا ہے۔

ندا فاضلی نے اپنے سوانحی ناول ''دیواروں کے بیچ'' اور ''دیواروں کے باہر'' میں جس طرح کی نثر لکھی ہے وہ اپنے آپ میں منفرد ہے۔ انھیں الفاظ کے برتنے پر دسترس حاصل ہے اور انھیں الفاظ کے ذریعہ انھوں نے اپنے احساسات و جذبات کو اپنے دائرے سے باہر نہیں نکلنے دیا۔ ''دیواروں کے بیچ'' سے ان کی نثر کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو ——

''سورج غروب ہو رہا ہے۔ ایک بے ہوش عورت کے گرد تین چار بچے سہمے ڈرے بیٹھے ہیں۔ چاروں طرف چتکبری روشنی پھیل جاتی ہے۔ سامنے املی کے درخت پر ایک ڈراؤنا بھوت روز کی طرح آج بھی آکر بیٹھ گیا ہے۔ لمبے لمبے دانت، ٹیڑھے میڑھے ہاتھ پاؤں، ہوا سے شاخیں ہلتی ہیں تو اس کی گرم سانسیں بہت قریب محسوس ہوتی ہیں۔ دالان سے آنگن میں آتے بھی ڈر لگتا ہے۔ بڑی بہن بھوت کو دفع کرنے کے لیے اندر سے قرآن شریف لاکر باہر اسٹول پر رکھ دیتی ہے۔ بچوں اور بھوت کے درمیان

اللہ کے کلام کی حد بن جاتی ہے۔ بھوت میں
اس حد کو پھلانگنے کی ہمت نہیں ہے لیکن جب
بھی نظر اٹھتی ہے وہ املی کی شاخوں سے
جھانکتا نظر آتا ہے۔ یہ بھوت قرآن کی حد
میں داخل تو نہیں ہوتا لیکن اپنی موجودگی کا
احساس پھر بھی دلاتا رہتا ہے۔ اس خوف
سے بھوک پیاس بھی غائب ہو جاتی ہے'' ۔[۴۹]

اپنے سوانحی ناولوں میں انھوں نے گاؤں، شہر، درخت، جن، بھوت، جھونپڑی اور کھیت وغیرہ کا ذکر کر کے اپنے اس اسلوب کی طرف اشارہ کیا ہے جو ان کی نظموں، غزلوں اور دوہوں میں ملتا ہے۔ ہندوستانی تہذیب کا دامن انھوں نے کہیں بھی نہیں چھوڑا اس سے ان کی وطن سے محبت کے جذبے کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس میں جتنے بھی کردار ہیں ان کا اپنا کوئی خاص مقام نہیں ہے۔ ہر کردار آتا ہے اور اپنی کہانی کہہ کر گزر جاتا ہے وقت جیسے جیسے گزرتا ہے ماں، بھائی، بہنیں، والد یہ وہ کردار ہیں جن میں ندا فاضلی نے جذبے کی کارفرمائی سے الگ رنگ دینے کی کوشش کی ہے، لیکن یہ بھی اچھا کیا ہے کہ انھوں نے ہر کردار کے ساتھ بے باکی سے کام لیا ہے جو جیسا ہے اسے ویسا ہی دکھانے کی کوشش کی ہے۔ ندا فاضلی نے جو کہ خود ان ناولوں کا مرکزی کردار ہیں اپنے کردار کو پیش کرنے میں بیباکی سے کام لیا ہے۔ ان کے اپنے گھر والوں سے کیسے رشتے رہے۔ والد صاحب کا طوائف کے ساتھ رشتہ اور ان کی ایک ناجائز اولاد اور خود کا بیر کمار کی بیوی سے جنسی تعلق یہ کچھ ایسے واقعات ہیں جن کا ذکر انھوں نے بغیر کچھ چھپائے کیا ہے۔ اپنی نثر میں انھوں نے کہیں بھی عبارت آرائی سے کام نہیں لیا اور نہ ہی کہیں پر انھوں نے فلسفیانہ انداز اختیار کیا۔ بلکہ عام فہم الفاظ کے ساتھ سادہ اور آسان عبارت آرائی سے کام لیا ہے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایک کامیاب شاعر میں اچھی نثر کے نمونے نہیں ملتے۔ لیکن ندا فاضلی ایک کامیاب شاعر کے ساتھ ساتھ ایک اچھے نثر نگار بھی ہیں۔ جب ان کا سوانحی

ناول قسط وار ''شاعر'' میں چھپا تو لوگ آنے والی قسط کے منتظر رہتے تھے اور اسی دوران لوگوں نے اس ناول پر تبصرے بھی کیے انھیں کے اصرار سے انھوں نے اسے کتاب کی شکل میں شائع کردیا۔ اس میں انھوں نے اپنے گھر والوں یا اپنے بارے میں جو بھی معلومات فراہم کی ہیں وہ واقعی ایک جرأت مندانہ قدم ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ ایسے موقعوں پر خود کو یا اپنے رشتے داروں کو بچالیتے ہیں اور کوئی بھی منفی بات یا تاثر پیش نہیں کرتے جو کہ اپنی تخلیق کے ساتھ ناانصافی ہے۔ انھوں نے ہر کردار کے ساتھ انصاف سے کام لیا ہے کسی کے مرتبہ کو نہ تو کم کیا ہے اور نہ ہی زیادہ، بلکہ جو جیسا ہے اسے ویسا ہی سامنے رکھ دیا ہے۔ انھوں نے کسی کے بارے میں خود کوئی فیصلہ نہیں کیا بلکہ وہ تو اپنے بیانیہ انداز میں سب کچھ پیش کرتے گئے ہیں۔ کسی کردار کا تعین کہ وہ کیا ہے یہ تو خود قاری کرتا ہے اور ہوا بھی ایسا ہی ہے۔ یہ فیصلہ کرنا ندا کا کام نہیں۔ رحمت بھائی، ساحر لدھیانوی، باقر مہدی، کمال امروہوی، کرشن چندر، سردار جعفری، پپو قصائی، نیاز حیدر، عصمت چغتائی، راہی معصوم رضا، اختر الایمان، افتخار عارف، جون ایلیا، عشرت، جمیل فاطمہ سب ان کے احاطہ قلم میں آئے ہیں لیکن کوئی اپنے دائرے سے باہر نہیں گیا ہے۔ ہر طبقے کے افراد کو انھوں نے ان ناولوں میں جگہ دی ہے اور کہیں بھی تعصب کا ذرا بھی عنصر نہیں ملتا۔

ان کے سوانحی ناولوں میں ایک فلم کی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے وہ دور کھڑے ہو کر سارا منظر نامہ دیکھ رہے ہوں اور اسے قلم بند کر رہے ہوں۔

ندا فاضلی کے سوانح کا پہلا حصہ یعنی ''دیواروں کے بیچ'' دہلی سے نومبر ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا۔ جب یہ ''شاعر'' میں شائع ہوا تو لوگوں کے خطوط کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ وارث علوی اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

> ''ندا کی شاعری مجھے پسند ہے۔ وہ ایک منفرد اسلوب کا شاعر ہے۔ ندا کی نثر بھی مجھے پسند ہے۔ اس کی کتاب ''ملاقاتیں'' شگفتہ اور رواں نثر کی اچھی مثال پیش کرتی ہے۔ اب اسی نثر کے سائے ''دیواروں کے بیچ تک آپہنچے ہیں۔ ان سایوں کی خنک

چھاؤں دل کش اور فرحت بخش ہے''۔۵

شہپر رسول نے بھی ایک خط میں ندا فاضلی کی نثر سے متعلق یہ بات کہی ہے:

''ندا فاضلی کی ''دیواروں کے بیچ'' بڑے دلچسپ انداز میں چل رہی ہے۔ ان کے اسلوب نگارش اور ان کی اچھوتی طبیعت دونوں نے یکجا ہو کر انفرادیت قائم کردی ہے''۔٦

ان کے خود نوشت سوانحی ناول کا دوسرا حصہ یعنی ''دیواروں کے باہر'' اس کے ۸ سال بعد ۲۰۰۰ء کو دہلی سے شائع ہوا۔ اس کے شروع میں ندا فاضلی نے اپنے گھر کا ذکر کیا ہے، اسی گھر کے لیے انھوں نے جتنی جدوجہد کی تھی کیا کیا پریشانیاں انھیں اٹھانی پڑیں۔ ان سب سے گذر کر آخر کار انھیں گھر مل ہی گیا۔ ناول کی ابتدا ایک نظم سے ہوتی ہے جس میں گھر کا ہی ذکر ہے:

جس گھر میں اب میں رہتا ہوں

وہ میرا ہے

اس کے کمروں کی آرائش

اس کے آنگن کی زیبائش

اب میری ہے...........

صاف طور پر ظاہر ہے انھوں نے نظم میں بھی وہی بات کہی ہے جو نثر میں کہی ہے۔ اس ناول کا پہلا اقتباس ملاحظہ ہو:

''روٹی، گھر، کپڑے اور کتابوں کو ایک جگہ کرنے میں اسے بیس سال سے زیادہ لگ گئے۔ الگ الگ سمتوں کے ان باسیوں کی یکجائی کی مدت ہر ایک کے ساتھ مختلف ہوتی ہے۔ ان چند خوش قسمت افراد کے علاوہ جس کو پیدائش سے ہی وراثت میں سب کچھ مل جاتا ہے، سبھی کو انھیں اکٹھا کرنے کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے''۔ ۷

ان کے ذہن میں وہی جدوجہد گردش کرتی رہی جس میں انھیں گوالیار سے

لیکر بمبئی تک سفر کرنا پڑا اور اس میں انھیں کتنے مراحل سے گزر کر آخر ایک گھر مل گیا۔ وہ گھر حاصل کر کے تھوڑا سکون ضرور حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن اس ناول میں ان کا اسلوب، بیانیہ مجروح ہوا ہے۔ اور ''دیواروں کے بیچ'' والی نثر ''دیواروں کے باہر'' میں نظر نہیں آتی۔

''دیواروں کے بیچ'' ۱۸۳ صفحات اور ''دیواروں کے باہر'' ۱۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ انھوں نے ان ناولوں میں اپنے عہد کا احاطہ دلکشی کے ساتھ کیا ہے۔ آخر میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح وہ ایک کامیاب شاعر تھے اسی طرح کامیاب نثر نگار بھی ہوئے اور انھوں نے اپنی تخلیقات سے اردو شعر و ادب میں اضافہ کیا ہے۔

ندا فاضلی کی ایک اور نثری کتاب ''دنیا میرے آگے'' ہے۔ یہ ۲۰۰۸ء میں دہلی سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں کل ۳۲ مضامین ہیں۔ جن میں انھوں نے کچھ میں اپنی زندگی سے جڑے ہوئے واقعات کا ذکر کیا ہے۔ کچھ مضامین ایسے ہیں جو اردو شعر و ادب کی مشہور شخصیات کے بارے میں ہیں جیسے۔ ''ایک تھے سردار جعفری'' ''ایک تھے راجندر سنگھ بیدی'' ''ایک تھے کرشن چندر'' ''ایک تھے شکیل بدایونی'' ''عصمت، چار حرفوں کا نام'' وغیرہ۔ اس طرح کے مضامین میں انھوں نے ان شخصیات کا ذکر بڑے بیباکانہ انداز میں کیا ہے۔

اس کتاب میں انھوں نے جن واقعات کا ذکر کیا ہے ان میں سے اکثر کا ذکر انھوں نے اپنے سوانحی ناول ''دیواروں کے بیچ'' اور ''دیواروں کے باہر'' میں بھی کیا ہے۔ اکثر جگہ تو ایسا لگتا ہے جیسے انھوں نے بالکل جیوں کا توں اٹھا کر ہی رکھ دیا ہو۔

اسی کتاب میں صفحہ ۲۸ پر ایک جگہ ندا فاضلی نے لکھا ہے کہ غالبؔ نے ایک مرتبہ ذوق کے ایک شعر کے بدلے اپنا پورا دیوان دینے کے لیے کہا تھا اور وہ شعر انھوں نے یہ لکھا ہے:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

قابل غور بات یہ ہے کہ انھوں نے اس واقعہ کو ذوقؔ سے منسوب کیا ہے جبکہ یہ واقعہ مومنؔ سے منسوب ہے اور وہ شعر یہ ہے:

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

یہ واقعہ بھی مشہور ہے اور شعر بھی بہت مشہور ہے۔ لیکن نہ جانے کس وجہ سے انھوں نے اس واقعے کو ذوق سے منسوب کیا ہے اگر یہ کتابت یا ٹائپنگ کی غلطی ہوئی تو ایک جگہ ہوتی یعنی مومن کی جگہ ذوق ہوتا لیکن اس کے ساتھ پورا شعر ہی غلط لکھ دیا گیا ہے:

> ''اسی صفحہ پر انھوں نے غالب کے انتقال کو ہوئے دو ڈھائی سو سال بتائے ہیں۔ وہ جملہ اس طرح ہے۔ ''مگر غالبؔ خوش قسمت تھے، وہ نظام الدین میں واقع اپنی قبر میں دو ڈھائی سو سالوں سے اکیلے گہری نیند سو رہے ہیں''۔ ''دنیا میرے آگے'' (ندا فاضلی ۲۸)

اب ذرا غور کیجئے غالب کا انتقال ۱۸۶۹ء کو ہوا۔ اس اعتبار سے جب ندا فاضلی کی یہ کتاب شائع ہوئی یعنی ۲۰۰۸ء میں تو غالب کو انتقال ہوئے ۱۳۹ سال ہوئے۔ ۱۳۹ سالوں کو تقریباً دو سو برس بھی نہیں کہا جا سکتا اور انھوں نے دو ڈھائی سو سال لکھ دیے۔ یقیناً یہ ندا فاضلی کا سہو ہے۔

حواشی

۱۔ ندا فاضلی کا تخلیقی سفر، ڈاکٹر سیفی سرونجی، ۲۰۱۰ء، ص: ۹۶

۲۔ اردو شاعری میں دوہے کی روایت، ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی

۳۔ ندا فاضلی کا تخلیقی سفر، ۲۰۱۰ء، ص: ۱۲۸

۴۔ دیواروں کے بیچ، ندا فاضلی، ص: ۷

۵۔ دیواروں کے بیچ، ندا فاضلی، ص: ۱۷۹

۶۔ دیواروں کے بیچ، ندا فاضلی، ص: ۱۸۱

۷۔ دیواروں کے باہر، ندا فاضلی، ص: ۷۔۸

کتابیات

ذیل میں ان کتب و رسائل کی فہرست پیش کی جاتی ہے جن سے کتاب کی ترتیب کے دوران تلاش مواد اور تحقیق مسائل کے سلسلے میں مدد لی گئی۔

۱۔ اردو نظم 1960 کے بعد، اردو اکادمی، دہلی، 2006

۲۔ جدیدیت اور ادب، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، 1969

۳۔ نظم جدید کی کروٹیں، وزیر آغا، ایجوکیشنل بک ہاؤس، 2000

۴۔ جدید نظم حالی سے میرا جی تک، کوثر مظہری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2008

۵۔ جدید شاعری، عبادت بریلوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1973

۶۔ شہر میں گاؤں، ندا فاضلی کلیات، معیار پبلی کیشنز، دہلی، 2012

۷۔ سنگ صدا، انتخاب، زبیر رضوی، ذہن جدید، 2014

۸۔ تنقیدی افکار، شمس الرحمٰن فاروقی، جنوری 2004

۹۔ ہماری شاعری، مسعود حسن رضوی ادیب، نظام پریس لکھنؤ، طبع نہم، 1964

۱۰۔ حاصلِ سیر جہاں، (کلیات) شہریار، مطبع لیتھو کلر پرنٹرس، علی گڑھ، 2001

۱۱۔ ندا فاضلی کا تخلیقی سفر، ڈاکٹر سیفی سرونجی، اسٹار گرافکس اینڈ پرنٹرس، 2010

۱۲۔ شہریار: حیات و خدمات، ڈاکٹر ساجد حسین انصاری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2014

۱۳۔ شیرازہ، ازمخمور سعیدی اور گوپال متل، مطبع یونین پرنٹنگ پریس، دہلی، 1962

۱۴۔ دنیا میرے آگے، ازندا فاضلی، 2008، معیار پبلی کیشنز، دہلی

۱۵۔ ملاقاتیں، ایڈیٹر ندا فاضلی، نیو رائٹرس پبلی کیشنز، دہلی

۱۶۔ آخری دن کی تلاش، محمد علوی، جون 1968، نیشنل آرٹ پرنٹرس، الہ آباد

۱۷۔ خالی مکان، محمد علوی، 1963، ناشر مکتبہ سوغات، بنگلور

۱۸۔ مخمور سعیدی ایک مطالعہ، اطہر فاروقی، علامہ اقبال کلچرل سوسائٹی، سکندر آباد، برانچ دہلی، اپریل 1986

۱۹۔ اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر، سید مجاور حسین، 1985، یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ

۲۰۔ اردو ادب میں قومی یکجہتی، مسعود حسین

۲۱۔ فرقہ وارانہ فسادات اور ہندوستانی پولیس، وبھوتی نرائن رائے، خبردار پبلی کیشنز، گیتا کالونی، دہلی، 2002

۲۲۔ جدید اردو غزل، (2010-1971) ڈاکٹر راحت بدر، ایم آر پبلی کیشنز، دریا گنج، نئی دہلی، 2011

۲۳۔ کھویا ہوا سا کچھ، ندا فاضلی، معیار پبلی کیشنز، نئی دہلی، 1996

۲۴۔ شہر میرے ساتھ چل تو، ندا فاضلی، مکتبہ جامعہ، 2004

۲۵۔ زندگی کی طرف، ندا فاضلی، نئی کتاب پبلی کیشنز، 2007

۲۶۔ سب کا ہے ماہتاب، ندا فاضلی، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، 2014

۲۷۔ لفظوں کا پل، ندا فاضلی، معیار پبلی کیشنز، دہلی، 1998

۲۸۔ آنکھوں بھرا آکاش، ندا فاضلی، نئی آواز پبلی کیشنز، نئی دہلی، 1986

۲۹۔ آنکھ اور خواب کے درمیان، ندا فاضلی، نئی آواز پبلی کیشنز، نئی دہلی، 1986

۳۰۔ نئی نظم کا سفر، (1936 کے بعد) خلیل الرحمٰن اعظمی، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی۔ 2011

۳۱۔ دیواروں کے بیچ، ندا فاضلی، معیار پبلی کیشنز، نئی دہلی، نومبر 1992

۳۲۔ دیواروں کے باہر، ندا فاضلی (یادداشتیں) ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی، 2016

۳۳۔ گفتنی، مخمور سعیدی، مکتبہ تحریک انصاری مارکیٹ دریا گنج، دہلی 1960

۳۴۔ واحد متکلم، مخمور سعیدی، نازش بک ڈپو، نئی دہلی، اکتوبر 1979

۳۵۔ خواب کا در دبند ہے، شہریار، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 1985

۳۶۔ شہریار فکر وفن، غزالہ پروین، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، 2012

۳۷۔ اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب، مرتبہ ڈاکٹر کاملِ قریشی، اردو اکادمی، دہلی، 2014

۳۸۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو نظم، ڈاکٹر عتیق اللہ، اردو اکادمی، دہلی، 2011

۳۹۔ متاعِ سخن، ترتیب اسلم پرویز، 2009، ذہنِ جدید، نئی دہلی

۴۰۔ اردو اصناف (نظم ونثر) کی تدریس، اومکار کول، مسعود سراج، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2010

۴۱۔ اردو شاعری کا مزاج، ڈاکٹر وزیر آغا، 1974

۴۲۔ اردو شاعری کا فنی ارتقاء، ڈاکٹر فرمان فتحپوری۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ ۱۹۹۹

۴۳۔ اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر۔ محمد حسن۔ ادارہ تصنیف دہلی۔ ۱۹۸۳

رسائل

۱۔ شاعر (ماہنامہ) بمبئی، جلد 87، شمارہ 10-9، ستمبر، اکتوبر 2016

۲۔ انکور (سہ ماہی) کلکتہ، جلد 3، شمارہ 8، اپریل، مئی، جون، 2016

۳۔ تہذیب الاخلاق (ماہنامہ) جلد 31، شمارہ 3، مارچ، 2012

۴۔ ہندی روزنامہ، ہندوستان، نئی دہلی، 19 فروری 2016، بروز منگل، ص: 12

۵۔ ایوانِ اردو (ماہنامہ) اپریل، 2016

۶۔ انتساب، ندا فاضلی نمبر، شمارہ نمبر 22، سہ ماہی

۷۔ ہماری زبان ہفت روزہ، 28-22، اپریل 2016، جلد 75، شمارہ 16

۸۔ ہماری زبان ہفت روزہ، 28-22، فروری 2018، جلد 77، شمارہ 8

۹۔ ماہنامہ اردو دنیا، اپریل 2016

۱۰۔ سہ ماہی، فکر و تحقیق، نئی دہلی، شمارہ 1، جلد 13، جنوری، فروری، مارچ 2010

۱۱۔ استفسار، شمارہ، 9-8، اکتوبر، 2015، مارچ 2016

۱۲۔ اعتراف، کتابی سلسلہ۔ 1، ندا فاضلی نمبر، اپریل 2005، ناشر ڈاکٹر رام پنڈت

۱۳۔ ایوانِ اردو، شمارہ 12، جلد نمبر 8، اپریل 1995

تبریک

بیسویں صدی کی اردو شاعری میں موضوعات اور ہیئت کے اعتبار سے بہت سی تبدیلیاں آئیں۔ معرا اور آزاد نظم کو ن۔م۔ راشد اور میراجی نے فروغ دیا۔ اقبال، جوش اور ان کے معاصرین نے پابند نظموں کو وقار بخشا۔ حلقۂ ارباب ذوق، ترقی پسند اور جدید شعرا نے شاعری میں نئے نئے تجربات کیے۔ 1960 کے بعد جن شعرا نے اردو شاعری میں ایک اہم مقام حاصل کیا ان میں ندا فاضلی ایک اہم نام ہے۔ ندا فاضلی ایک ہمہ جہت شخصیت کا نام تھا۔ شعری ذوق انہیں وراثت میں ملا تھا۔ انہوں نے غزل اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کی اور شہرت پائی۔ شاعری کے علاوہ سوانحی ناول اور خاکے بھی لکھے۔ عزیزی محمد یوسف رضا نے ندا فاضلی کی شاعرانہ عظمت کو انتہائی محنت اور دیانتداری کے ساتھ اس کتاب میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ محمد یوسف رضا ایک ذہین اسکالر ہیں انہوں نے ندا فاضلی کی غزل گوئی اور نظم نگاری کا ناقدانہ انداز میں جائزہ لیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ محمد یوسف رضا کی یہ کتاب ندا فاضلی کی شاعری کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوگی۔

پروفیسر ابن کنول

سابق صدر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی دہلی

۳۰ جنوری ۲۰۱۹

NIDA FAZLI
Hayaat-o-Jehaat

by

Mohd. Yusuf Raza

ندا فاضلی: حیات و جہات از: محمد یوسف رضا

ندا فاضلی جدید شعرا میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے ۱۹۶۰ء کے بعد آنے والی ادبی نسل میں اپنا ایک منفرد مقام بنایا ہے۔ نظم اور غزل ہر دو اصناف میں موضوع اور اسالیب کے لحاظ سے اپنی الگ شناخت قائم کی۔ انھوں نے روزمرہ اور ہندوستانی زبان میں شاعری کرتے ہوئے اپنے قارئین اور سامعین کا حلقہ خاصا وسیع کر لیا۔ وہ مشاعروں میں بھی بہت مقبول رہے۔ ان کا دوہے پڑھنے اور سنانے کا انداز بہت دلچسپ ہوتا تھا۔ انھوں نے فلموں کے لیے بھی نغمے اور غزلیں لکھیں۔

محمد یوسف رضا نے ندا فاضلی پر یہ کتاب لکھ کر ایک اہم اقدام کیا ہے۔ محمد یوسف رضا ایک ایسے نوجوان ہیں جو ادب فہمی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لینے کی طرف گامزن ہیں۔ اس کتاب میں ندا فاضلی کی زندگی اور عہد کے اہم نقوش بھی پیش کیے گئے ہیں۔ ندا کی نظموں پر مصنف نے خصوصی توجہ کی ہے اور نمائندہ نظموں کے تجزیے بھی پیش کیے ہیں۔ موضوعات اور اسالیب کے پیش نظر محمد یوسف رضا نے ندا کی نظموں تک پہنچنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ جدیدیت کے عہد میں شاعری کرتے ہوئے بھی بقول مصنف "ندا نے ایسا اسلوب اختیار کیا ہے کہ جس سے قاری کو نظم کی تفہیم میں دشواری نہیں ہوتی"۔

ندا فاضلی کی شعری کائنات کی تعبیر و تفسیر پیش کرنے اور اس کتاب کی اشاعت پر محمد یوسف رضا کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے مجھے خوشی بھی ہو رہی ہے اور ایک طرح سے طمانیت قلب کا احساس بھی ہو رہا ہے کہ نئی نسل میں ادب فہمی کی راہیں کھل رہی ہیں۔

پروفیسر کوثر مظہری

شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

۳ فروری ۲۰۱۹

ISBN 978-93-88736-80-0

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
New Delhi, INDIA